Registered No. L. 5340

جلد ۳۴
عدد ۶

ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-		
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ فی	-/۹/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ - الف ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن

فہرستِ مضامین

جلد ۳۴ | ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۰ء | عدد ۶

سید انور نجم مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے وہ پچھلے اٹھارہ سال میں دو مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب تیسرے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ پہلا مرحلہ خالص تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کا تھا جس کا سلسلہ تقریباً ۹ سال جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ تنظیم و تربیت کا تھا اور اس میں تقریباً ۶ سال صرف ہوئے۔ اب تیسرا مرحلہ توسیع اور عملی اقدام کا ہے جسے شروع ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ اس موقع پر اپنے موجودہ موقف اور آئندہ راہ عمل کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس تحریک کا اور اس کے پچھلے کام کا جائزہ لیں، پھر دیکھیں کہ اس وقت ہم کن حالات اور مسائل سے دوچار ہیں اور ان میں ہمیں کیا کام کس طرح کرنا ہے۔

یہ تحریک جس مقصد کے لئے اٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

"انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال، مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت، معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے"

یہ مقصد اول روز سے ہمارے پیش نظر رہا ہے اور آج بھی یہی ایک مقصد ہے جس کے لئے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ ہمارے پیش نظر کبھی تھا، نہ آج ہے، نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا۔ آج تک جس کام سے بھی ہم نے دلچسپی لی ہے اسی مقصد کے لئے لی ہے، اور اسی حد تک لی ہے جس حد تک ہماری دانست میں اس کا تعلق اس مقصد سے تھا۔

جس چیز کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اس کا جامع نام قرآن کی اصطلاح میں "دین حق" ہے، یعنی وہ نظام زندگی (دین) جو حق (پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق اللہ کی بندگی و اطاعت) پر مبنی ہو۔ مگر اس کے لئے کبھی کبھی

ہم نے "حکومتِ الٰہیہ" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے جس کا مفہوم دوسروں کے نزدیک چاہے جو کچھ بھی ہو، ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ "اللہ کو حاکم حقیقی مان کر پوری انفرادی و اجتماعی زندگی اس کی حکومت میں بسر کرنا"۔ اس لحاظ سے یہ لفظ بالکل "اسلام" کا ہم معنیٰ ہے۔ اسی بنا پر ہم ان تینوں اصطلاحوں (دینِ حق، حکومتِ الٰہیہ، اور اسلام) کو مترادف الفاظ کی طرح بولتے رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کا نام ہم نے اقامتِ دین، شہادتِ حق، اور تحریکِ اسلامی رکھا ہے جن میں سے پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور دوسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں سے کسی پر اگر لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لئے کہ انھوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا۔ ہمارا مفہوم مراد لیتے تو امید نہ تھی کہ اس پر وہ ناراض ہوتے۔

ہمارے نزدیک اسلام اُن لوگوں کی جائداد نہیں ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں بلکہ خدا نے یہ نعمت اُن سب کے لئے بھیجی ہے جو انسان پیدا ہوئے ہیں خواہ وہ روئے زمین کے کسی خطے میں بستے ہیں۔ اس بنا پر ہمارا مقصد محض مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی زندگی کو دینِ حق پر قائم کرنا ہے۔ مقصد کی یہ وسعت آپ سے آپ تقاضا کرتی ہے کہ ہمارا اپیل عام رہے اور کسی مخصوص قوم کے مفاد کو مدِّنظر رکھ کر کوئی ایسا طرزِ عمل نہ اختیار کیا جائے جو اسلام کے اس عام اپیل کو نقصان پہنچانے والا ہو یا اُس کی نقیض واقع ہوتا ہو۔ مسلمانوں سے ہماری دلچسپی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم اُن میں پیدا ہوئے ہیں اور وہ ہماری قوم ہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہماری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کو مانتے ہیں، دُنیا میں اس کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں، نوعِ انسانی تک اس کا پیغام پہنچانے کے لئے انھی کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اور دوسروں کے لئے اس پیغام کو مؤثر بنانا اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں پورے اسلام کا صحیح نمونہ پیش کریں۔ اسی بنا پر ہمارا راستہ اُن لوگوں کے راستے سے ہمیشہ الگ رہا ہے اور آج بھی الگ ہے جنھیں مسلمانوں سے اصل دلچسپی اس لئے ہے کہ وہ ان کی قوم ہیں اور اسلام سے یا تو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے یا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ ان کی قوم کا مذہب ہے۔

ہم نے اپنے مقصد کے لحاظ سے اپنی تحریک کو اس طرز پر اٹھایا ہے کہ ایک طرف اس کی دعوت تمام انسانوں کے لئے عام رہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کو اسلام کی مکمل اور صحیح قولی اور عملی شہادت دینے کے لئے تیار

کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی اسلام اور مسلم قومیت کے فرق و امتیاز کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ ہم نے اسلام کے اصول و احکام اور اسلامی دعوت کے مفاد کو ہمیشہ قوم اور قومی مفاد پر مقدم رکھا ہے اور جہاں کہیں ان دونوں چیزوں میں تناقض واقع ہوا ہے وہاں ایک لمحے کے لئے بھی اسلام کی خاطر قوم اور اس کے مفاد سے لڑ جانے میں تامل نہیں ہوا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود برقرار رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک ورلڈ کی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ہماری اس پوزیشن کو وہ لوگ کبھی نہ سمجھ سکے جو اسلام اور مسلم قومیت کو گڈ مڈ کرتے ہیں، یا قوم کو دین پر مقدم رکھتے ہیں، یا دین کے بجائے صرف قوم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے راستے اگر کبھی کہیں ملے بھی تو عارضی طور پر اس جگہ جہاں اتفاقاً اسلام نے ہمیں اور ان کو جمع کر دیا، ورنہ اکثر ہمارے اور ان کے طرز فکر و عمل میں تصادم ہی رہا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہم کو بارہا "غداری" کے طعنے بھی سننے پڑے ہیں۔ مگر یہ طعنے ہمارے لئے بالکل بے معنی ہیں۔ ہم وفاداری کا مستحق صرف خدا اور رسول کو سمجھتے ہیں، پھر اس کو جو خدا اور رسول کا وفادار ہو۔ اس وفاداری سے انحراف تو البتہ ہمارے نزدیک دنیا و آخرت میں لعنت کا موجب ہے لیکن اگر اس وفاداری میں ہم ثابت قدم ہوں تو پھر دوسری چیز جس کا بھی ہمیں غدار ٹھہرایا جائے وہ ہمارے لئے باعث شرم نہیں بلکہ باعث فخر ہے۔

"دین حق" اور "اقامت دین" کے تصور میں بھی ہمارے اور بعض دوسرے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم دین کو محض پوجا پاٹ اور چند مخصوص مذہبی عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک یہ لفظ طریق زندگی اور نظام حیات کا ہم معنی ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں اور تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ زندگی کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر الگ الگ نظریات اور الگ الگ اسکیموں کے تحت چلایا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تقسیم اگر کی بھی جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو انسانی جسم کے اعضا کی طرح ایک دوسرے سے ممیز ہونے کے باوجود آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ وہ سب مل کر ایک کل بن جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک ہی روح جاری و ساری ہوتی ہے۔ یہ روح اگر خدا اور آخرت سے بے نیازی

اور تعلیم انبیاء سے بے تعلقی کی روح ہو تو پوری زندگی کا نظام ایک دینِ باطل بن کر رہتا ہے اور اس کے ساتھ خدا پرستانہ مذہب کا ضمیمہ اگر لگا کر رکھا بھی جائے تو مجموعی نظام کی فطرت بتدریج اس کو مضمحل کرتے کرتے آخر کار بالکل محو کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ روح خدا و آخرت پر ایمان اور تعلیم انبیاء کے اتباع کی روح ہو تو اس سے زندگی کا پورا نظام ایک دینِ حق بن جاتا ہے جس کے حدودِ عمل میں ناخدا شناسی کا فتنہ اگر کہیں رہ بھی جائے تو زیادہ دیر تک پنپ نہیں سکتا۔ اس لئے ہم جب "اقامتِ دین" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب محض مسجدوں میں دین قائم کرنا، یا چند مذہبی عقائد اور اخلاقی احکام کی تبلیغ کر دینا نہیں ہوتا، بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ گھر اور مسجد، کالج اور منڈی، تھانے اور چھاؤنی، ہائی کورٹ اور پارلیمنٹ، ایوانِ وزارت اور سفارت خانے، سب پر اُسی ایک خدا کا دین قائم کیا جائے جس کو ہم نے اپنا رب اور معبود تسلیم کیا ہے اور سب کا انتظام اُسی ایک رسول کی تعلیم کے مطابق چلایا جائے جسے ہم اپنا ہادیٔ برحق مان چکے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہماری ہر چیز کو مسلمان ہونا چاہیے۔ اپنی زندگی کے کسی پہلو کو بھی ہم شیطان کے حوالے نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں سب کچھ خدا کا ہے شیطان یا قیصر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ہماری ان باتوں پر وہ سب لوگ برہم ہیں جنھوں نے مذہب کا ایک محدود تصور اختیار کر رکھا ہے، جو تفریقِ دین و دنیا اور بالفاظِ دیگر مذہب و سیاست کے قائل ہیں، جن کے نزدیک زندگی خدا اور قیصر کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے، اور جن کی نگاہ میں خدا پرستی کا دین بے خدا تمدن و سیاست کے ساتھ زندگی کا بٹوارا قبول کر سکتا ہے اور صرف مسجد و خانقاہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باقی سب کچھ اپنے حریف کے لئے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ لوگ ہم پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ تم مذہب کی تبلیغ کرو، سیاست میں کیوں دخل دیتے ہو؟ مگر ہم اس بات کے قائل ہیں کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اب کیا یہ لوگ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہماری سیاست پر چنگیزی مسلط رہے اور ہم مسجد میں "مذہب" کی تبلیغ کرتے رہیں؟ اور آخر وہ مذہب کونسا ہے جس کی تبلیغ کے لئے وہ ہم سے کہہ رہے ہیں؟ اگر وہ پادریوں والا مذہب ہے جو سیاست میں دخل نہیں دیتا، تو ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ قرآن و حدیث کا مذہب ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، تو وہ سیاست میں محض دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اُس کو اپنا ایک جزو بنا کر

رکھنا چاہتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے، اب سیاسی گروہ بن گئے ہو۔ حالانکہ ہم پر کبھی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے "مذہبی" رہے ہوں۔ اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو "اسلام" کے پیرو ہیں اور اسی کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جتنا مذہبی ہے اتنے ہی ہم مذہبی ہیں اور ابتدا سے تھے اور وہ جتنا "سیاسی" ہے اتنے ہی ہم سیاسی ہیں اور ابتدا سے تھے۔ تم نے نہ کل ہمیں سمجھا تھا جبکہ ہم کو "مذہبی" گروہ قرار دیا، اور نہ آج سمجھا ہے جبکہ ہمارا نام "سیاسی جماعت" رکھا ہے۔ سیاست اور مذہب دونوں میں تمہارا استاد یورپ ہے۔ اس لئے نہ تم نے اسلام کو سمجھا اور نہ ہمیں۔

کوئی کہتا ہے کہ خدا تو صرف معبود ہے، تم نے یہ سیاسی حاکمیت اس کے لئے کہاں سے ثابت کر دی؟ اور اس پر غضب یہ ہے کہ تم اس حاکمیت کو اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہو اور انسانی حاکمیت کے منکر ہو۔ یہ تو خالص خارجیت ہے، کیونکہ تمہاری طرح خارجی بھی یہی کہتے تھے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ مگر ہمارے نزدیک قرآن اور حدیث کی رو سے خدا کا حق صرف عبادت و پرستش ہی نہیں ہے بلکہ طاعت و عبدیت بھی ہے۔ ان امور میں سے جس حق میں بھی خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا جائے گا، شرک ہوگا۔ بندوں میں سے کسی کی اطاعت اگر کی جا سکتی ہے تو صرف خدا کے اذنِ شرعی کی بنا پر کی جا سکتی ہے اور وہ بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر۔ رہا خدا سے بے نیاز ہو کر مستقل بالذات مطاع ہونا تو وہ تو رسولؐ کا حق بھی نہیں ہے کجا کہ کسی انسانی ریاست یا سیاسی و تمدنی ادارے کا حق ہو۔ جس قانون، عدالت اور حکومت میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو سند نہ مانا جائے، جس کا بنیادی اصول یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے جملہ معاملات میں اصول اور فروع تجویز کرنا انسانوں کا اپنا کام ہے، اور جس میں قانون ساز مجلس خدائی احکام کی طرف رجوع کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تسلیم کرتی ہوں اور عملاً ان کے خلاف قوانین بناتی ہوں، اس کی اطاعت کے لزوم تو درکنار جواز تک کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے۔ اس بلا کو زیادہ سے زیادہ صرف برداشت کیا جا سکتا ہے جبکہ انسان اس کے پنجۂ اقتدار میں گرفتار ہو جائے۔ مگر جو شخص ایسی حکومتوں کے حقِ فرمانروائی کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات کو ایک اصلِ برحق

کی حیثیت سے مانتا ہے۔ لہٰذا یہ بات تو چھوڑ کر انسان اللہ سے بے نیاز ہو کر خود اپنے تمدن، سیاست اور معیشت کے اصول اور قوانین وضع کر لینے کے مجاز ہیں، وہ اگر اللہ کو مانتا ہے تو شرک میں مبتلا ہے ورنہ زندقہ میں۔ ہمارے اس مسلک کو "خارجیت" سے تعبیر کرنا مذہب اہل سنت اور مذہب خوارج، دونوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ علماء اہل سنت کی لکھی ہوئی کتب اصول میں سے جس کو چاہیے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں یہی لکھا ملے گا کہ حکم دینے کا حق اللہ کے لئے خاص ہے۔ مثال کے طور پر علامہ آمدی اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں: اعلم انه لاحاكم سوى الله ولا حكم الا ما حكم به۔ "جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور حکم صرف وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے۔" اور شیخ محمد خضری اپنی اصول الفقہ میں کہتے ہیں: ان الحكم هو خطاب الله فلا حكم الا لله وهذه قضية اتفق عليها المسلمون قاطبة۔ "درحقیقت حکم اللہ کے فرمان کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔" یہ صرف دو "خارجیوں" کے اقوال ہم نے بطور مثال نقل کر دیے ہیں۔ اس طرح کے "خوارج" کی آپ جس قدر چاہیں طویل فہرست دی جا سکتی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو چڑ چڑا کر پوچھتے ہیں کہ یہ حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کا قیام کس نبی کی دعوت کا مقصود رہا ہے؟ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ جو قرآن اور توراۃ میں عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ دیوانی اور فوجداری قوانین، اور صلح و جنگ کے احکام، اور معیشت و معاشرت کے قواعد و ضوابط، اور سیاسی تنظیم کے اصول بیان ہوئے ہیں کیا یہ سب محض تفنن طبع کے لئے ہیں؟ کیا یہ آپ کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے کہ کتاب اللہ کی تعلیمات میں سے جس چیز کو چاہیں جزو دین مانیں اور جسے چاہیں غیر ضروری زوائد میں شمار کریں؟ کیا انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی نظام قائم کئے وہ ان کی پیغمبرانہ دعوت کے مقاصد میں سے نہ تھے، محض اتفاقات سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنا شوقِ فرمانروائی پورا کیا تھا؟ کیا دنیا میں کوئی قانون اس لئے بھی بنایا جاتا ہے کہ صرف اس کی تلاوت کر لی جائے، اس کا نفاذ سرے سے مقصود ہی نہ ہو؟ کیا واقعی ایمان اسی چیز کا نام ہے کہ ہم روز اپنی نمازوں میں کتاب اللہ کی وہ آیات پڑھیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اصول اور احکام بیان ہوئے ہیں اور رات دن ہماری زندگی کے اکثر و بیشتر معاملات اُن کے خلاف چلتے رہیں؟

خدا کی بندگی جس پر ہم پورے نظامِ زندگی کو قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں بھی ہمارا ایک واضح مسلک ہے اور وہ مختلف گروہوں کو مختلف وجوہ سے پسند نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک ہر شخص اس کا مختار نہیں ہے کہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جس طرح چاہے خدا کی بندگی کرے، بلکہ اس کی ایک ہی صحیح صورت ہے اور وہ اُس شریعت کی پابندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ اس شریعت کے معاملے میں کسی مسلمان کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس کی جن باتوں کو چاہے قبول کرے اور جن باتوں کو چاہے رد کر دے، بلکہ ہم اسلام کے معنی ہی اطاعتِ حکمِ خداوندی اور اتباعِ شریعتِ محمدی کے سمجھتے ہیں۔ شریعت کے علم کا ذریعہ ہمارے نزدیک صرف قرآن نہیں ہے بلکہ حدیث بھی ہے، اور قرآن و حدیث سے استدلال کا صحیح طریقہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے نظریات پر خدا اور رسول کی ہدایات کو ڈھالے بلکہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نظریات کو خدا اور رسول کی ہدایات پر ڈھالے۔ پھر ہم نہ تو تقلیدِ جامد کے قائل ہیں جس میں اجتہاد کی جگہ نہ ہو، اور نہ ایسے اجتہاد کے قائل ہیں کہ ہر بعد کی نسل اپنے سے پہلے کی نسلوں کے سارے کام پر پانی پھیر دے اور بالکل نئے سرے سے ساری عمارت اٹھانے کی کوشش کرے۔

اس مسلک کا ہر جز ایسا ہے جس سے ہماری قوم کا کوئی نہ کوئی گروہ ہم سے ناراض ہے۔ کوئی سرے سے خدا کی بندگی کا قائل ہی نہیں ہے۔ کوئی شریعت سے بے نیاز ہو کر اپنی صواب دید کے مطابق خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے۔ کوئی شریعت میں اپنا اختیار چلانا چاہتا ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ اسے پسند ہے وہ اس شریعت میں رہے، اور جو اُسے پسند نہیں ہے وہ شریعت سے خارج ہو جائے۔ کوئی قرآن و حدیث سے قطع نظر کر کے اپنے من گھڑت اصولوں کا نام اسلام رکھے ہوئے ہے۔ کوئی حدیث کو چھوڑ کر صرف قرآن کو مانتا ہے۔ کوئی اصول اور نظریات کہیں باہر سے لے آیا ہے یا اپنے دل سے گھڑ لیا ہے اور پھر زبردستی قرآن و حدیث کے ارشادات کو اُن پر ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی کو تقلیدِ جامد پر اصرار ہے اور کوئی تمام پچھلے ائمہ کے کارناموں کو دریا برد کر کے نیا اجتہاد کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا راستہ ان سب گروہوں سے الگ ہے اور ہم مجبور ہیں کہ ان سے اختلاف بھی کریں اور ان کے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ بھی کریں۔ اسی طرح دوسروں کے بھی اس حق کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جس بات کو بھی ہم کو غلطی پر سمجھتے ہیں اس میں ہم سے اختلاف کریں اور ہمارے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ کریں۔ اب ہر شخص جو ہندوستان و پاکستان میں رہتا ہے اور

(بقیہ صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

جماعت اسلامی کی انتخابی جدّوجہد

اس کے مقاصد اور طریقِ کار

جماعت اسلامی نے پنجاب کے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس میں تین متعین مقصد اس کے پیشِ نظر ہیں:-

اول یہ کہ انتخاب کے غلط طریقوں کی اصلاح کی جائے اور اُن صحیح طریقوں کا عملاً مظاہرہ کیا جائے جو اسلام کے احکام اور اس کی اخلاقی روح کے مطابق ہیں۔

دوم یہ کہ بحالتِ موجودہ ہماری سوسائٹی میں سیرت اور قابلیت کے لحاظ سے جو زیادہ صالح اور اہل افراد مل سکتے ہوں، اُن کو صوبے کا آئندہ نظم ونسق چلانے کے لئے منتخب کرایا جائے۔

سوم یہ کہ ۱۹۳۵ء کے غیر جمہوری دستور میں صوبوں کی حکومتوں کو جو محدود اختیارات حاصل ہیں ان کو استعمال کر کے کم از کم اس صوبے میں نظامِ اسلامی کی تعمیر، اجتماعی انصاف کے قیام، اور نظم ونسق کی اصلاح کے ایک پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا جائے۔

یہ تین مقصد نگاہ میں رکھ کر جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح کرنا چاہتے ہیں اس کی مختصر تشریح میں اس مضمون میں کروں گا۔

طریقۂ انتخاب کی اصلاح

امیدواری کے عیوب

انتخاب کے جو طریقے ہم نے اپنے سابق مغربی آقاؤں اور استادوں سے سیکھے ہیں، اُن میں فتنے کی جڑ امیدواری ہے۔ امیدواری اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے حکومت کی ہوس، طاقت کی حرص اور اقتدار کے لالچ کا دوسرا نام ہے۔ یہ چیز بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص یا گروہ امیدوار بن کر اٹھ رہا ہے وہ حکومت کی بھاری ذمے داریوں کے بجائے اس کے فوائد ومنافع پر نظر رکھتا ہے۔ ورنہ

ظاہر ہے کہ جس کی نظر فوائد کے بجائے اس کام کی ذمہ داریوں پر ہو اور جسے احساس ہو کہ خدا اور خلق کے سامنے اس کی کیسی سخت جواب دہی اس کو کرنی ہو گی، وہ اس بارِ عظیم کو خود اٹھانے کا خواہشمند نہیں ہو سکتا، الّا یہ کہ یہ بوجھ اس پر ڈال دیا جائے۔ لہٰذا امیدواری فی نفسہ ایک ایسی علامت ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ جس شخص میں یہ چیز پائی جاتی ہے اس کا نفس احساسِ ذمہ داری سے خالی اور حرص و طمع کے جذبات سے لبریز ہے۔

موجودہ زمانے میں اس گھناؤنی حقیقت کو بہت سے خوشنما الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہم ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس لئے اٹھ رہے ہیں کہ اگر ہم نہ اٹھیں گے تو بُرے اور نالائق لوگ منتخب ہو جائیں گے۔ ہم اصلاح اور ترقی کا ایک پروگرام رکھتے ہیں اور قوم سے اس لئے ووٹ مانگتے ہیں کہ اگر وہ اسے پسند کرے تو اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں منتخب کرلے۔ اور قوم آخر خود کس طرح کام کے آدمی چھانٹ سکتی ہے جب کہ کام کا ارادہ اور خواہش رکھنے والے لوگ خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اور اپنے پروگراموں کو اس کے سامنے پیش نہ کریں۔ ایسی ہی اور بہت سی دوسری باتیں یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں کہ امیدواری محض لالچ ہی کی بنا پر نہیں بلکہ بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت کی نیت سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن تمام حیلوں اور دلیلوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ جس خدمت کے ساتھ خطرات نقصانات اور تکالیف وابستہ ہوں اس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا تو بلا شبہ ایک سچے جذبۂ خدمت کی علامت ہو سکتا ہے، مگر جہاں خدمت اور دولت و حکومت باہم ملی جلی ہوں وہاں اپنے آپ کو خود پیش کرنے میں اخلاص کے امکانات بہت کم اور حرص و طمع کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ یہ بات محض ایک عقلی قیاس کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ اب تک کے تجربات نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ جو لوگ جذبۂ خدمت کے دعوے لے کر اٹھے ان میں بہت ہی کم ایسے نکلے جنھوں نے برسرِ اقتدار آکر بے غرضانہ خدمت انجام دی ہو، ورنہ اکثر و بیشتر نے خدمت کے بجائے حکومت کے فوائد ہی سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس چیز کی شکایت صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ امریکہ اور فرانس جیسے جمہوری ملکوں میں بھی یہ شکایت عام ہے۔

انتخابی جد وجہد کے ناپاک طریقے امیدواری کی ان ذاتی خرابیوں پر مزید اضافہ ان طریقوں سے ہو جاتا ہے جو امیدوار اشخاص اور گروہ اپنی کامیابی کے لئے اختیار کرتے ہیں

جھوٹے پروپگنڈا سے رائے عام کو دھوکا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ روپے کے زور سے ووٹ خریدے جاتے ہیں۔ نسلوں اور برادریوں کے نام سے ووٹ مانگ کر امت میں تفرقے پیدا کئے جاتے ہیں۔ مختلف طبقوں اور پیشہ ور گروہوں کی خود غرضیوں سے اپیل کرکے ان کو ایک دوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما کیا جاتا ہے۔ اصول اور پروگرام پیش کرنے کے بجائے کہیں جاہلانہ عصبیتیں ابھار کر اور کہیں ناجائز فائدوں کی توقعات دلاکر رائے عام کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک امیدواری اپنی غرض کی خاطر ہزار فتنے اٹھا کر رہتی ہے جن کی وجہ سے قومی اخلاق، تمدن، معاشرت اور سیاست کو بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی انتخابی جدوجہد میں قوم کا صالح عنصر تو اس کے گھناؤنے پن کی وجہ سے شریک ہی نہیں ہوتا، رہے غیر صالح عناصر، تو ان میں سے بھی وہ سب لوگ ناکام رہ جاتے ہیں جو نسبتاً کم جھوٹے، کم زردار اور کم فتنہ پرداز ہوتے ہیں؟ اور قوم کے معاملات کو سنبھالنے کے لئے وہ بدترین اشخاص چھانٹ لئے جاتے ہیں جو بد اخلاقی کی اس جنگ میں تمام بد اخلاقوں کو شکست دے دیتے ہیں۔

پارٹی سسٹم کی برائیاں

یہ خرابیاں محض شخصی امیدواری کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ جن لوگوں کو سیاسی پارٹیاں اپنے ٹکٹ پر کھڑا کرتی ہیں ان کی امیدواری میں بھی یہی سب خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اس صورت میں خرابیوں کا پیمانہ کچھ زیادہ ہی وسیع ہو جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا ظاہری طریق کار بڑا خوشنما ہوتا ہے جسے دیکھ کر لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتی ہیں اپنے بیان کردہ اصولوں اور پروگراموں کی خاطر کرتی ہیں لیکن درحقیقت ان پارٹیوں میں شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی لائق آدمی کو اس کی اپنی طلب و خواہش کے بغیر خود پارٹی کی طرف سے محض یہ دیکھ کر ٹکٹ دیدیا جائے کہ وہ اعلیٰ قابلیت رکھتا ہے، قابلِ اعتماد سیرت کا مالک ہے اور پارٹی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موزوں آدمی ہے۔ پارٹی کے ٹکٹ بالعموم مالدار اور با اثر لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو اس غرض کے لئے مدتوں سازشیں اور جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں، اور جن سے پارٹی کے کسی مضبوط دھڑے کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اس کی معاشی و سیاسی اغراض کی خدمت کریں گے۔ یہ عیب صرف ہمارے ملک ہی کے پارٹی سسٹم میں نہیں ہے بلکہ ان تمام ملکوں میں کم و بیش، پایا جاتا ہے۔ جہاں جمہوریت میں پارٹی سسٹم کارفرما ہے۔ کہیں اس کے عیوب سطح پر نمایاں ہیں، اور کہیں گہرائی میں

پوشیدہ۔ بہرحال یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ پارٹی ٹکٹ میں وہ تمام برائیاں موجود ہوتی ہیں جو شخصی امیدواری میں پائی جاتی ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو یہ کہ شخصی امیدواری میں ایک شخص تنہا اپنی اغراض کے لئے کام کرتا ہے اور پارٹی سسٹم میں بہت سے خود غرض لوگ منظم طریقے سے اپنی مقصد برآری کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

اسلام امیدواری کا مخالف ہے : اسلام اسی وجہ سے امیدواری کا مخالف ہے۔ اس نے یہ مستقل اصول قائم کیا ہے کہ حکومت میں ذمے داری کا کوئی منصب کسی ایسے شخص کو نہ دیا جائے جو خود اس کا طالب ہو۔ اس باب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ قرآن میں صاف فرمایا گیا ہے :۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ (القصص۔ ۹)

وہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) تو ہم اُن لوگوں کے لئے رکھیں گے جو زمین میں خود اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں، اور عاقبت صرف خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃ سے فرمایا :۔

لاتسأل الامارۃ فانک ان اعطیتھا عن غیر مسئلۃ اُعِنتَ علیھا وان اعطیتھا عن مسئلۃ وُکِلتَ الیھا۔ (بخاری و مسلم)

حکومت کی [illegible] کیونکہ اگر وہ تجھے بے طلب دی گئی تو خدا کی طرف سے تیری مدد کی جائیگی اور اگر وہ تیرے مانگنے سے تجھے دی گئی تو تجھ کو اسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :۔

تجدون من خیر الناس اشد ھم کراھیۃ لھذا الامر حتی یقع فیہ۔ (بخاری و مسلم)

تم لوگ ایسے شخص کو بہترین اشخاص میں سے پاؤ گے جو حکومت کے منصب سے سخت کراہیت رکھتا ہو یہاں تک کہ وہ مجبوراً اس میں مبتلا ہو جائے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ میں اپنے رشتہ داروں میں سے دو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دونوں صاحبوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم کو حکومت میں کسی منصب پر مقرر فرمایا جائے۔ اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کے مختلف فقرے مختلف روایات میں وارد ہوئے ہیں، بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدًا سألہ ولا احدًا حرص علیہ۔

خدا کی قسم ہم اس حکومت کے کسی منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کا طالب ہو اور نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کا حریص ہو۔

دوسری روایت میں ہے:۔

لا نستعمل علیٰ عملنا من ارادہ۔

ہم اپنی حکومت کے کام میں کسی ایسے شخص کو استعمال نہیں کرتے جو خود اس کا خواہشمند ہو۔

ابوداؤد میں آپؐ کے یہ الفاظ آئے ہیں:۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ۔

تم میں سب سے بڑا خائن ہمارے نزدیک وہ شخص ہے جو اس چیز کا طالب ہو۔

جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی

رسولِ برحقؐ کے یہ ارشادات بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے، جن کی سچائی پر عقلِ سلیم گواہی دے رہی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ یہ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزادانہ امیدواری کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی، نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا

آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے، ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے، اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

صالحین کے انتخاب کا طریقہ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان پُرانے طریقوں کو چھوڑ کر جماعت وہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کرے گی جس سے ہماری اسمبلی کے لئے صالح آدمی منتخب ہو سکیں؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کو ختم کر کے انتخاب کا یہ طریقہ رائج کرنا چاہتے ہیں کہ عوام الناس خود اپنے اندر سے بہتر آدمیوں کو چھانٹیں اور ان سے خود درخواست کریں کہ وہ ان کے نمائندے بننا قبول کر لیں لیکن یہ مختصر جواب ان لوگوں کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا جو پرانی ڈگر پر چلنے کے خوگر ہیں اور کسی نئی بات کو آسانی سے اخذ نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں ذرا وضاحت کے ساتھ بتاؤں گا کہ اس نئے طریقے کو عملی جامہ پہنانے کی تفصیلی صورت کیا ہو گی۔

عوام کی ذہنی و اخلاقی تربیت سب سے پہلا کام جو اس سلسلے میں ہم کریں گے وہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت ہے۔ ہم ایک طرف پچھلے تجربات پر تنقید کر کے ان کو بتائیں گے کہ آج تک جن خرابیوں کا خمیازہ وہ بھگت رہے ہیں ان کے اصل اسباب کیا تھے، اور دوسری طرف انھیں ایسی تعلیم دیں گے جس سے وہ اپنا ووٹ صحیح طریقے پر استعمال کر سکیں۔ ہم ان کو بتائیں گے کہ اب تک ووٹ دینے کے معاملے میں وہ کیا غلطیاں کرتے رہے ہیں جن کی وجہ سے غیر صالح، نا اہل اور نا قابلِ اعتماد لوگ ان کے نمائندے بنتے رہے۔

ہم ان کو بتائیں گے کہ اب تک تم کسی نہ کسی پارٹی پر اندھا اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے ہاتھ میں دیتے رہے ہو، اس نے جس کو ٹکٹ دے دیا تم نے آنکھیں بند کر کے اسی کو ووٹ دیدیا۔ خدا نے جو آنکھیں تم کو دی تھیں انھیں کھول کر تم نے خود یہ نہ دیکھا کہ جس شخص کو ہم ووٹ دے رہے ہیں وہ کس اخلاق، کس سیرت و کردار، اور کس قابلیت کا آدمی ہے۔ اس کی سزا تم نے یہ پائی کہ جن لوگوں پر تم نے بھروسہ کیا تھا انھوں نے تم سے دغا کی انھوں نے اپنے مطلب کے آدمی چن چن کر اسمبلیوں میں بھر دئیے اور پھر متحد و منظم ہو کر وہ لوٹ مچائی اور تمہارے مفاد کی طرف سے ایسی آنکھیں پھیریں کہ آج تم میں کا ہر شخص ان کے لگائے ہوئے زخموں سے کراہ رہا ہے۔ اب اس تجربے سے

فائدہ اٹھاؤ۔ اپنے معاملے کو دوسروں کے ہاتھ میں دینے کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لو۔ آنکھیں بند کرکے کوئی کام نہ کرو۔ خدا نے یہ آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں۔ انہیں کھول کر دیکھو کہ جس آدمی کو تم کسی سالی کے لئے اپنے ملک کے انتظام پر مسلط کر رہے ہو وہ کہاں تک بھروسے کے لائق ہے۔

ہم ان کو بتائیں گے کہ اب تک تمہارے سامنے اسمبلی کی ممبری کے لئے اگر کوئی معیار رہا بھی ہے تو وہ غلط معیار رہا ہے۔ تم نے اپنے نمائندے میں اگر کوئی صفت تلاش کی تو یہ کی کہ وہ چالاک ہو تاکہ چالبازیوں میں حریف قوموں کا مقابلہ کر سکے۔ یا یہ کہ وہ تمہاری برادری کا آدمی ہو تاکہ دوسری برادریوں کے مقابلے میں تمہارا سر اونچا ہو۔ یا یہ کہ وہ بااثر ہو تاکہ تمہارے بیٹوں کو نوکریاں دلوائے، تمہیں ناجائز فائدے اٹھانے میں ہر طرح مدد دے، اور اس کے زیر سایہ رہ کر تم ہر قسم کے جرائم کرکے بھی پولیس اور عدالت کی پکڑ سے بچ سکو۔ لیکن تجربے نے تمہیں بتا دیا کہ یہ سارے معیار غلط تھے۔ چالباز آدمی صرف باہر والوں ہی کے ساتھ چالبازیاں نہیں کرتا بلکہ اپنی وہی چالیں گھر والوں کے ساتھ بھی چلتا ہے، کیونکہ اس کے پاس تو ایک ہی سکہ ہے جسے وہ اندر بھی چلائے گا اور باہر بھی۔ با اثر آدمی اگر ایسا بے ایمان ہے کہ دوسروں کو ناجائز فائدے پہنچانے میں بھی تامل نہیں کرتا تو تم کیسے بھروسہ کر سکتے ہو کہ وہ خود ناجائز فائدے اٹھانے سے باز رہ جائے گا۔ رہی برادری، تو آدمی کی اصل خوبی اس کی نسل اور اس کا خاندان نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان ہے۔ جو شخص ایماندار ہے وہ چاہے کسی برادری کا ہو، بہر حال سب سے وفا اور سب کے ساتھ انصاف کرے گا، اور جو ایماندار نہیں ہے اس سے کوئی بھی وفا اور انصاف کی امید نہیں کر سکتا، نہ برادری کا اور نہ برادری کے باہر کا۔ اس لئے اب برادریاں دیکھنے کا طریقہ چھوڑو اور ایمان کی صفت تلاش کرو۔

ہم ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی یاد دلائیں گے کہ کما تکونون کذالک یؤمر علیکم (جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حکمران بنائے جائیں گے) اور اعمالکم عمالکم (تمہارے اپنے اعمال ہی تمہارے حاکموں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں) ہم ان سے کہیں گے کہ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو اور یہ تمنا رکھتے ہو کہ خداوند تعالیٰ تم پر اچھے حاکم مقرر کرے تو اپنے آپ کو بدلو، اپنے اخلاق ٹھیک کرو، اپنی نیتیں درست کرو، اور اپنے خدا کے وفادار بنو۔ تم خدا سے دغا کرنا چھوڑ دو گے تو خدا بھی تم پر ان حاکموں کو مسلط نہ کرے گا جو تم سے دغا کریں۔

ہم ان کے سامنے نظام اسلامی، اجتماعی انصاف اور نظم ونسق کی اصلاح کا ایک واضح پروگرام رکھیں گے

اور ان سے کہیں گے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ یہ پروگرام برحق ہے اور تمہارے درد کا مداوا بن سکتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ تسلیم کریں گے کہ یہ پروگرام برحق بھی ہے اور ان کی مصیبتوں کا صحیح علاج بھی تو پھر ہم ان سے کہیں گے کہ اب تم خود تلاش کرو کہ تمہارے درمیان اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صالح لوگ کون ہیں۔

صالح کا معیار

پھر ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا نہ کریں گے کہ تم اپنے اندر صالح آدمی تلاش کرو بلکہ ان کے سامنے صالحیت کا ایک واضح معیار بھی رکھیں گے تاکہ آدمیوں کو پرکھنے میں انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ ایک اسلامی نظام حکومت کو چلانے کے لئے آدمی میں چار شرطیں پائی جانی ضروری ہیں:

اول یہ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں اسلام کا سچا پیرو ہو۔ وہ خدا کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ادا کرتا ہو۔ وہ کھلے کھلے گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔ اس کے گھر میں خدا کے قوانین علانیہ نہ توڑے جاتے ہوں۔

دوم یہ کہ تم نے اپنے تجربے میں اس کو ایک سچا، ایماندار اور کھرا آدمی پایا ہو۔ تمہاری بستیوں کے عام لوگ اس بات کے گواہ ہوں کہ وہ ایک نیک انسان ہے۔ وہ جھوٹا اور بدمعاملہ آدمی نہ ہو۔ وہ حرام خور، ظالم اور دوسروں کے حق مارنے والا نہ ہو۔ وہ رشوتیں کھانے اور کھلانے والا نہ ہو۔ اس کا دامن لوٹ مار سے، ناجائز الاٹمنٹوں سے اور بلیک مارکٹنگ سے پاک ہو۔

سوم یہ کہ وہ دین اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ بڑا عالم فاضل اور کسی دینی مدرسے کا سند یافتہ ہو لیکن بہرحال اسلام کے اصولوں سے اس کا واقف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک وہ اسلام کو جانے گا نہیں، آخر وہ ایک اسلامی نظام حکومت چلائے گا کیسے؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بھی اچھی واقفیت رکھتا ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ آخر ان سیاسی، معاشی، تمدنی، تعلیمی، قانونی اور انتظامی مسائل کو کیسے سمجھے گا جن پر اسے اسلام کے اصولوں کو منطبق کرنا ہے؟

چہارم یہ کہ وہ جاہ طلب اور اقتدار کا حریص نہ ہو۔ اُس سے ایسی کوئی بات ظہور میں نہ آئے جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ اسمبلی میں جانے کے لئے خود کوشاں ہے۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہماری ان شرطوں کو دیکھ کر لوگوں کے دل خود گواہی دیں گے کہ بلا شبہ ایک صالح آدمی میں یہی شرطیں پائی جانی چاہئیں۔ تاہم اگر کوئی اللہ کا بندہ ہماری ان شرائط میں کوئی کمی یا بیشی تجویز کر سکتا ہو

تو ضرور کرے، ہم دلی شکریہ کے ساتھ اس کی تجویز قبول کریں گے۔

انتخابات کے لئے عوام کی تنظیم

اس طرح عوام کے ذہن کو صحیح انتخاب کے لئے تیار کرنے کے بعد ہم دوسرا قدم اٹھائیں گے اور وہ یہ ہوگا کہ ہمارے کارکن ہر جگہ عوام کو انتخاب کے لئے منظم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑنا چاہتے کہ کوئی شخص دو چار یا دس پانچ حامیوں کے ذریعے سے اپنی صالحیت کا پروپیگنڈا شروع کر دے اور پھر یہ اعلان کرا دے کہ اس کو صالح دیکھ کر لوگوں نے اسے اسمبلی کی ممبری کے لئے اٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس قسم کی حیلہ سازیوں کی روک تھام کے لئے، اور واقعی اہل اور صالح آدمیوں کو چھانٹنے کے لئے ہم ہر حلقۂ انتخاب میں پورے اعلان کے ساتھ عام اور کھلے جلسے کر کے لوگوں کو دعوت دیں گے کہ وہ اپنی محلہ وار اور قریہ وار انتخابی پنچائتیں بنائیں[1]، ان میں باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمام تعصبات اور اغراض سے دلوں کو پاک کر کے، پوری ایمانداری کے ساتھ یہ رائے قائم کریں کہ ان کے درمیان کون لوگ ایسے ہیں جو مذکورۂ بالا شرائط کے مطابق صالح کہے جا سکتے ہیں[2]۔ اگر خدا نخواستہ وہ اپنے محلہ یا اپنی بستی میں کسی کو موزوں نہ پائیں تو اپنے حلقۂ انتخاب کے لوگوں پر نظر ڈالیں۔ اگر پورے حلقے میں کوئی نظر نہ آتا ہو تو اپنے حلقے سے باہر دیکھیں۔

اس سلسلے میں جتنے نام پیش کئے جائیں گے۔ ان کو عام لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور ہر ایک کو کھلی تنقید کا موقع دیا جائے گا تاکہ جس کا جو کچھ بھی حسن و قبح ہے کھل کر سامنے آجائے۔

پھر اس تنقید سے جو لوگ چھٹ کر نکل آئیں گے ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا اور ان سے درخواست کی جائے گی کہ وہ بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ اپنے اندر سے ایک مردِ صالح کو چھانٹ لیں۔ جہاں یہ تدبیر چل سکے گی وہاں بدرجہ آخر قرعہ اندازی سے کام لیا جائے گا۔

---

[1] جماعت اسلامی کے ارکان اور ہمدرد ہر جگہ اپنے اپنے محلوں اور بستیوں کی پنچایتوں میں شریک ہوں گے۔ وہ ان سے الگ رہ کر محض ان کی تنظیم کر دینے ہی پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ان کے اندر شامل ہو کر انتخاب کے کام میں ان کی مدد بھی کریں گے۔

[2] اس غرض کے لئے ہم ہر پنچایت کے تمام ارکان سے اس عہد نامے پر دستخط لیں گے جو علیحدہ طبع ہو چکا ہے۔ پنچایت میں صرف انہی لوگوں کو شریک کیا جائے گا جو اس عہد نامے پر دستخط کر چکے ہوں۔

اس طریقے سے جو شخص بھی چھانٹا جائے گا اُسے حلقۂ انتخاب کے عوام کی طرف سے کھڑا کیا جائے گا۔ وہ شخص خواہ جماعتِ اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو، یہ جماعت اسی کی تائید کرے گی[1]۔ اس کو اپنا زرِ ضمانت خود ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حلقۂ انتخاب کے عام لوگ اس کی طرف سے ادا کریں گے۔ وہ انتخاب کی مہم میں ایک پیسہ اپنی جیب سے خرچ نہ کرے گا۔ سارا خرچ حلقہ کے لوگ کریں گے۔ وہ اپنی تعریف کے گن آپ نہ گاتا پھرے گا، اور نہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے ایجنٹ چھوڑے گا۔ اس کے اوصاف وہ لوگ بیان کریں گے جنھوں نے اسے کھڑا کیا ہوگا اور وہی اس کے حق میں عام رائے دہندوں کی رائے ہموار کریں گے۔ اس کی ذات پر اگر کیچڑ اچھالی جائے گی تو اسے صاف کرنے کی زحمت وہ خود نہ اٹھائے گا۔ یہ فرض اس کی طرف سے دوسرے لوگ انجام دیں گے۔ اس کو یہ حق تو ضرور ہوگا کہ کسی دوسرے حلقے میں کسی دوسرے مردِ صالح کی تائید کے لئے جا کر انتخابی جدوجہد کرے، اگر خود اپنے حلقے میں اپنے لئے کوئی جدوجہد کرنے کا حقدار نہ ہوگا۔ اپنے حلقے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ اسے کرنا ہوگا وہ صرف یہ کہ اگر حلقے کے عام لوگ اس کو دیکھنا اور اس کے خیالات سننا چاہیں گے تو وہ ان کے جلسوں میں آئے گا اور ان کو موقع دے گا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھیں اور ہر پہلو سے پرکھ لیں۔

اسمبلی کے اندر کام کا نقشہ

اوپر جس طریقِ کار کی تشریح کی گئی ہے اس کے مطابق جو لوگ انتخابات میں نمائندگی کے لئے کھڑے کئے جائیں گے ان سے حلقۂ انتخاب کے بھرے جلسوں میں، اور جامع مسجدوں میں برسرِ عام ایک عہد لیا جائے گا جو

---

[1] واضح رہے کہ اگر کسی حلقۂ انتخاب کی پنچایت جماعت اسلامی کے کسی رکن پر اعتماد کا اظہار کرکے اسے اپنی نمائندگی کے لئے لینا چاہے گی تو جماعت اس رکن کی خدمات پیش کر دے گی، اور اگر کوئی پنچایت ہمارے کسی رکن کا نام لئے بغیر ہم سے درخواست کرے گی کہ ہم اپنا کوئی آدمی اس کو دیں تو اس صورت میں ہم اپنی صوابدید کے مطابق کوئی اہل آدمی اس کے لئے تجویز کر دیں گے۔ اور اگر کوئی پنچایت بالاتفاق یا بالاکثریت کے ساتھ کسی ایسے شخص کو صالح قرار دے جو مسلم لیگ، عوامی لیگ یا کسی اور جماعت سے تعلق رکھتا ہو تو ہمیں اس کا ساتھ دینے میں بھی تامل نہ ہوگا بشرطیکہ وہ اپنی پارٹی کے ٹکٹ پر نہ اٹھا ہو اور اپنی نامزدگی کے لئے خود کسی قسم کی دوڑ دھوپ نہ کر رہا ہو۔

حسبِ ذیل اجزا پر مشتمل ہوگا:۔

نمائندوں کا عہدنامہ

(۱) وہ خدا اور رسول کی وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھیں گے اور پوری خدا ترسی اور ایمانداری کے ساتھ ملک کا انتظام شریعتِ خداوندی کے احکام اور اس کی روح کے مطابق چلانے کی کوشش کریں گے۔

(۲) وہ اسمبلی کے اندر یا اس کے باہر اپنی پوزیشن سے اپنی ذاتی اغراض یا اپنے خاندان، احباب کی اغراض یا کسی خاص طبقے اور گروہ کی اغراض کے لئے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں گے۔

(۳) وہ اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام سے قریب تر رہیں گے، عام لوگوں کی شکایات، مشکلات اور ضروریات سے اور ان کے جذبات و احساسات سے باخبر رہیں گے، اور اپنی حد تک پوری کوشش کریں گے کہ آئین انصاف کے مطابق بے لاگ طریقے سے عوام کی خدمت کریں۔

(۴) اگر کسی وقت حلقۂ انتخاب کے عام لوگ اسی طریقے سے ان پر اظہارِ بے اعتمادی کریں جس طریقے سے وہ آج ان پر اظہارِ اعتماد کر رہے ہیں تو وہ اپنی نشست سے استعفا دیدیں گے۔

(۵) وہ اسمبلی کے اندر دھڑے بندیوں، سازشوں اور وزارت کے جوڑ توڑ سے الگ رہیں گے۔ صاف صاف ایماندارانہ طریقے سے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے جو انہیں عوام کی رضامندی سے دیا جائے گا۔ اور اپنی وزارت صرف اس صورت میں بنائیں گے جبکہ اسمبلی میں اس پروگرام کے حامیوں کی اکثریت ہوگی۔

(۶) وہ اسمبلی کے اندر متفرق ہو کر نہ رہیں گے بلکہ ان صالح نمائندوں کے ساتھ جو اس طریقے سے منتخب ہو کر گئے ہوں اور اس پروگرام کے پابند ہوں، مل کر ایک پارٹی بنائیں گے اور متحد ہو کر کام کریں گے۔

اسمبلی پارٹی کا نظم

اوپر جس پارٹی کا ذکر کیا گیا ہے اُس کا نظم بھی عام پارٹیوں کے نظم سے مختلف ہوگا، اس میں اس امر کی تو ضرور کوشش کی جائے گی کہ ہر مسئلے پر اسمبلی سے پہلے پارٹی کے اجتماعات میں بحث کر لی جائے اور حتی الامکان پارٹی ایک متفق رائے پر پہنچ کر اسمبلی کے مباحث میں حصہ لے لیکن پارٹی کے ارکان اس بات کے پابند نہ ہوں گے کہ ان کی ایماندارانہ رائے خواہ کچھ بھی ہو بہرحال ہر معاملہ میں ووٹ اپنی پارٹی کے حق میں ہی دینا ہوگا، پارٹی کا مطالبہ اپنے ارکان سے صرف یہ ہوگا کہ وہ پارٹی پروگرام کے بنیادی

مقاصد اور اصولوں کے پابند رہیں۔ اصولی اختلاف البتہ برداشت نہ کیا جائے گا، مگر جزئیات و فروعات کے معاملے میں ارکان کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ ایسے معاملات میں جو ارکان پارٹی کی اکثریت کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوسکیں گے اُن کو حق ہوگا کہ اسمبلی میں اپنے خیالات آزادی کے ساتھ پیش کریں اور جب دوسری پارٹی کی بات کو درست سمجھیں اُس کے حق میں ووٹ دیں۔ ایسا کرنا پارٹی ڈسپلن کے خلاف ہوگا۔ اور نہ اس بنیاد پر کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

اگر اس پارٹی کو اسمبلی میں وزارت بنانے کا موقع ملے گا تو وہ مخالف پارٹیوں کے مقابلے میں اس ضد اور ہٹ دھرمی اور جماعتی تعصب سے کام نہ لے گی جو عام طور پر اکثریت رکھنے والی جماعتوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ کھلے دل سے سب کی بات سنے گی۔ ہر صحیح بات کو قبول کرے گی اور معقول دلائل کے مقابلے میں کبھی اپنی تجویزوں اور تدبیروں پر بیجا اصرار نہ کرے گی۔

وہ اس طریقے کی بھی پابند نہ ہوگی کہ جب کبھی وزارت کی کسی تجویز کو اسمبلی میں شکست ہوجائے تو وہ ضرور ہی وزارت سے استعفیٰ دیدے۔ استعفیٰ دینے کے بجائے وہ بالعموم اکثریت کی بات مان لیا کرے گی۔ البتہ وہ مستعفی اُس صورت میں ہوگی جبکہ اکثریت کی رائے کو قبول کرنے سے اُس کے پروگرام کے کسی بنیادی اصول پر زد پڑتی ہو، یا وزارت ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اکثریت کی رائے انصاف کے یا مفادِ قومی کے خلاف ہے، یا پھر اکثریت اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرے۔

پروگرام

اوپر جس پروگرام کا ذکر کیا گیا ہے اُس کے بارے میں پیشگی کچھ کہنا میرے لئے مشکل ہے۔ جماعت اسلامی عنقریب اسے مرتب کرکے عوام الناس کے سامنے پیش کرنے والی ہے۔ اس کام میں دیر لگنے کی ایک اہم وجہ ہے۔ اگر محض جھوٹے وعدوں کا ایک مینا بازار لگا کر عوام کو فریفتہ کرنا پیشِ نظر ہوتا تو چند ساعتوں میں ایک منشور بنا کر پھینک دیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم صرف وہی لائحۂ عمل پیش کرنا چاہتے ہیں، جسے فی الواقع عمل میں لایا جاسکے۔ اور اس طرح کا لائحہ مرتب کرنے میں اس وقت ایک سخت دشواری درپیش ہے۔ انتخابات سارے ملک میں نہیں ہورہے ہیں بلکہ صرف ایک صوبے میں ہورہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے جس دستور پر اس وقت ہماری حکومت کا نظام قائم ہے اس میں صوبوں کے اختیارات اول تو ویسے ہی بہت کم ہیں، اصل طاقت مرکز کے ہاتھ میں ہے، پھر

جبکہ مرکز پر ایک خاص پارٹی کلیتہً چھائی ہوئی ہو اور وہ پورے ملک کو جابرانہ گرفت کے ساتھ اپنے ڈھب پر لئے جا رہی ہو، کسی ایسی پارٹی کے لئے کام کرنا سخت مشکل ہے جو مرکزی حکمرانوں کے علی الرغم صرف ایک صوبے میں برسرِ اقتدار آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ ایک ایسا لائحہ مرتب کر رہے ہیں جسے مرکز کے عناد اور مزاحمت کے باوجود پنجاب میں جامۂ عمل پہنانے کی توقع کی جا سکتی ہو۔

متوقع نتائج

یہ طریقِ کار جس کی مختصر تشریح اوپر کی سطور میں کی گئی ہے اس ملک میں بلکہ تمام جمہوری ممالک میں پہلی مرتبہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر عمل کر کے ہم کتنے حلقہ ہائے انتخاب سے صالح نمائندے منتخب کرانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ نشستوں کے لحاظ سے اس کوشش کے نتائج غیر یقینی ہیں، ان کا انحصار بہت بڑی حد تک اس امر پر ہے کہ ہمارے کارکن کہاں تک اس طریقِ عمل پر اس کی صحیح اسپرٹ کے مطابق کام کرتے ہیں، عوام کس حد تک اس ذہنی و اخلاقی تربیت اور اس انتخابی تنظیم کو قبول کرتے ہیں، اور حکومت کی انتظامی مشینری کہاں تک دیانت اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ تاہم اس وقت ہماری نگاہ میں اصل اہمیت اس کی نہیں ہے کہ کتنی نشستیں صالح نمائندوں کے لئے حاصل کی جا سکیں گی، بلکہ اس بات کی ہے کہ ہمارے ملک میں ایک صحیح طریقِ انتخاب کی ابتدا ہو جائے۔ اس کوشش کے چند نتیجے ہمارے نزدیک یقینی ہیں۔

اولاً اس طریقے سے جتنے نمائندے بھی منتخب ہوں گے وہ ان شاء اللہ ہماری سوسائٹی کے بہترین لوگ ہوں گے۔ اگر وہ کسی بڑی تعداد میں نہ بھی جا سکے، صرف دس پانچ آدمی ہی جا سکے، تب بھی ان سے ایک صحیح قسم کی حزب الاختلاف وجود میں آئے گی جو کشمکشِ اقتدار سے بچ کر پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ اسلام کے برحق اور منصفانہ اصولوں کی نمائندگی کرے گی اسے چاہے طاقت حاصل نہ ہو، مگر اس کی موجودگی میں طاقت والوں کو وہ دھاندلی چلانے کا موقع نہ مل سکے گا جس کے نمونے سابق پنجاب اسمبلی میں دیکھے جا چکے ہیں، اور آج بھی دوسرے صوبوں میں اور مرکز میں نظر آ رہے ہیں۔

ثانیاً اس ذریعے سے ہمارے عوام کو پہلی مرتبہ ایسی تربیت کا موقع ملے گا جو ان کے اندر صحیح مذہبی،

اخلاقی اور سیاسی شعور پیدا کرے گی اور ان کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنے قومی معاملات کو خود سمجھیں، بھلے اور بُرے میں تمیز کریں، کام کے آدمیوں کو پرکھیں، اور اپنی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو قابلِ اعتماد سیرت و قابلیت کے مالک ہوں۔ اس نئے طریقِ انتخاب سے وہ دور رخصت ہو جائے گا جس میں ہمارے ملک کی پبلک بے عقل جانوروں کی طرح ہانکی اور جذباتی نعروں کے سیلاب میں بہائی جاتی تھی۔

ثالثاً، یہ طریقِ انتخاب جتنا جتنا رواج پاتا جائے گا، انشاء اللہ ہماری قوم کا دینی و اخلاقی معیار بلند اور ہمارا اجتماعی ماحول پاکیزہ ہوتا چلا جائے گا۔ قاعدے کی بات ہے کہ مارکیٹ میں جس چیز کی مانگ ہوتی ہے اسی کی پیداوار بڑھتی ہے اور جس کی مانگ نہیں ہوتی اس کی پیداوار گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اب تک ہمارے ہاں نیک، شریف اور راستباز لوگوں کی کہیں پوچھ ہی نہ تھی۔ آگے بڑھنے کے سارے مواقع صرف ان لوگوں کے لئے کھلے ہوئے تھے جو عیّار اور سازشی ہوں اور اپنی اغراض کے لئے ہر طرح کی بھلی اور بری تدبیریں کرنے میں آزاد ہوں۔ اسی وجہ سے پہلی قسم کی صفات ہمارے ہاں گھٹ رہی تھیں اور دوسری قسم کی صفات کو روز بروز زیادہ فروغ نصیب ہو رہا تھا۔ اب اگر حالات کا رخ بدلے گا، اگر ہمارے ہاں نیکی اور شرافت کی، اور دینداری اور صداقت کی پوچھ ہونے لگے گی، اور اگر لوگ دیکھیں گے کہ بددیانتی جھوٹ، فریب اور خود غرضانہ چالبازیوں سے اس بدلے ہوئے ماحول میں آدمی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے پھینکا جانے لگتا ہے، تو دیکھتے دیکھتے طبائع کا رجحان بدل جائے گا اور لوگ خود بخود بری صفات کے بجائے بھلی صفات اپنے اندر پرورش کرنے لگیں گے۔

رابعاً، ہم توقع رکھتے ہیں کہ جدوجہد کا یہ نیا میدان خود ہمارے کارکنوں کی تربیت کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس میں صرف یہی نہیں کہ ان کو براہِ راست عوام سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ملےگا اور وہ عمومی اصلاح کے کام کا تجربہ حاصل کریں گے، بلکہ اس کے ساتھ انشاء اللہ ان کا اپنا اخلاقی تزکیہ بھی بڑی خوبی کے ساتھ ہوگا۔ ایک مدت دراز سے ہماری قومی سیاست پر وہ لوگ چھائے رہے ہیں جو خدا سے بے خوف اور اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے اجتماعی ماحول کو کچھ بیت الخلا کے ماحول سے بھی زیادہ گندا کر دیا ہے اور حالت یہ ہوگئی ہے کہ کوئی شخص اصلاحِ احوال کے لئے ایک قدم بھی غلاظت کی چھینٹیں کھائے بغیر نہیں چل سکتا۔ ایسے وقت میں اس قسم کے لوگوں کے علی الرغم انتخاب کی جدوجہد کرنا اور

ایسے طریقے سے کرنا جس میں یہ لوگ صریح طور پر اپنی سیاسی زندگی کی موت دیکھ رہے ہیں، بڑا عزم، بڑا ضبط و تحمل، بڑا صبر اور بڑا اخلاص چاہتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس راہ میں کامیابی کے لئے خدا اور اس کے دین سے سچا تعلق اور امت محمدیہ کے لئے خیر خواہی کا بے لوث جذبہ درکار ہے۔ ہمارے کارکنوں کو اس راہ میں ہر قسم کی گالیوں سے، جھوٹے الزامات سے اور غیر شریفانہ مزاحمتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ اگر وہ خدا کے فضل سے ان ساری چیزوں کا مقابلہ سنجیدگی، شرافت اور روحانی کے ساتھ کر لے گئے تو یقیناً ان کے نفس پہلے سے زیادہ پاک ہو جائیں گے اور وہ خدا کی راہ میں اس سے زیادہ بڑے کام کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی توفیق سے میری اور میرے رفقا کی مدد فرمائے۔

استدراک

سطور بالا میں امیدواری کے خلاف قرآن و حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں بعض لوگوں نے چند دلائل پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں مناصب حکومت کے لئے امیدوار ہونا جائز ہے۔ ذیل میں ہم ان کے دلائل مع جواب درج کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلا استدلال حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے کیا جاتا ہے کہ انھوں نے شاہ مصر سے فرمایا تھا اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ "مجھے ملک کے خزانوں پر حاکم مقرر کر دیجئے، میں حفاظت کرنے والا اور کاردان ہوں" امیدواری کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک نبی کا فعل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں بیان فرمایا ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی اس کی مذمت نہیں کی ہے۔ لہٰذا اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ عام قانون بیان کرتی ہے، اور حضرت یوسف کا یہ واقعہ محض ایک استثنا کی نظیر ہے۔ عام قانون تو یہی ہے کہ ایک خدا ترس آدمی کو خود برتری و بالا دستی کا طالب نہ ہونا چاہیے۔ مگر اس میں ایک مستثنیٰ صورت یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر کوئی صالح شخص یا گروہ یہ دیکھے کہ

ملک میں کوئی صالح آدمی یا گروہ اس کے سوا موجود نہیں ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر اس نے خود آگے بڑھ کر زمامِ کار ہاتھ میں نہ لی تو خدا کی زمین کا انتظام فساق و فجار یا کفار و مشرکین کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور نظامِ صالح برپا کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا، تو اس صورت میں اُس مردِ صالح یا گروہ صالح کے لئے جائز بلکہ لازم ہے کہ اپنے آپ کو منصبِ حکومت کے لئے خود پیش کرے۔ حضرت یوسف نے یہ فعل ایسے ہی حالات میں کیا تھا۔ اُس وقت پورے ملک مصر میں کوئی مومنِ صالح ان کے سوا موجود نہ تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ شاہِ مصر اُن کا معتقد ہو چکا ہے اور اس کی عقیدت مندی کی وجہ سے سرزمینِ مصر میں ایک صالح نظامِ حکومت قائم کرنے کا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے انھوں نے بلا تامل خود آگے بڑھ کر مطالبہ کیا کہ زمامِ کار میرے ہاتھ میں دو۔ ایسی صورتِ حال اگر خدانخواستہ آج یہاں پیدا ہو جائے تو ہم یقیناً صلحاء کے لئے امیدواری کو جائز قرار دیں گے لیکن ہمارے نزدیک اس ملک کی موجودہ صورتِ حال یہ نہیں ہے، اس لئے ہم اس عام قاعدے ہی پر عمل کرنا صحیح سمجھتے ہیں جو اوپر قرآن و حدیث کی سند سے بیان کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے کیا جاتا ہے جس میں خدا کے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا (الفرقان ۔ ۲)	اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہماری بیویوں اور اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ امامت، پیشوائی اور سرداری کی تمنا کرنا اور اس کا خواہشمند ہونا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ لیکن یہ غلط نتیجہ ہے جو اس آیت سے نکال لیا گیا ہے۔ دراصل یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ اس زمانے میں نازل ہوا تھا جبکہ مکہ معظمہ میں اسلام کی دعوت ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس وقت ساری قوم انکار و مخالفت پر تلی ہوئی تھی، چند مٹھی بھر آدمی ایمان لائے تھے اور ان کا بھی یہ حال تھا کہ کسی کی بیوی کافر تھی، کسی کی اولاد ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھی، اور کسی کے باپ، بھائی اور دوسرے قریب ترین عزیز اسلام کی دشمنی میں سرگرم تھے۔ اس حالت میں اہلِ ایمان جو دعائیں مانگا کرتے تھے

ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہماری بیویوں اور بچوں کو کفر و جاہلیت کی حالت سے نکال کر ایمان و تقویٰ کے زیورں سے آراستہ کردے تاکہ وہ ہمارے لئے خارِ چشم بننے کے بجائے نورِ چشم بن جائیں، اور اس قوم میں سے جن جن لوگوں کے دلوں میں بھی تقویٰ موجود ہے ان کو یہ توفیق دے کہ وہ بھی اس راہ میں ہماری پیروی کریں۔ اس سیاق میں "امامت" سے مراد سبقت اور پیش روی ہے۔ سابقین بالایمان لامحالہ اُن سب لوگوں کے پیش رو اور مقتدا تھے جو اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوئے۔ دعا کا حقیقی مقصود یہ نہ تھا کہ ہم امام و پیشوا بن جائیں بلکہ یہ تھا کہ ہم راہِ حق میں اکیلے نہ رہ جائیں، دوسرے متقین کو بھی ہماری پیروی کی توفیق نصیب ہو، ہم اس راہ کے تنہا مسافر نہ ہوں، ایک پورا قافلہ ہمارے پیچھے آئے۔

تاہم اگر پس منظر سے قطع نظر کرکے محض آیت کے الفاظ ہی تک نگاہ محدود رکھی جائے تب بھی امام المتقین بننے کی دعا کا سیدھا سادا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا ہمیں سب پرہیزگاروں سے بڑھ کر پرہیزگار بنا دے اور ہمیں اس قابل کردے کہ پرہیزگاروں کے گروہ میں ہم سب سے پیش پیش ہوں۔ یہ مفہوم زیادہ قریب کا بھی ہے اور اسلام کی اخلاقی روح سے زیادہ مناسبت بھی رکھتا ہے۔ اسے چھوڑ کر آخر اس دعا کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ "خدایا تو ہمیں متقیوں کا حاکم بنا دے۔"

(۳) امیدواری کے جواز میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

من طلب قضاء المسلمین حتی ینالہ ثم غلب عدلہ جورہ فلہ الجنۃ، ومن غلب جورہ عدلہ فلہ النار۔	جس نے مسلمانوں کی حکومت میں قاضی کا عہدہ طلب کیا یہاں تک کہ اس کو پالیا پھر اس کا عدل اس کے ظلم سے بڑھا رہا تو اس کے لئے جنت ہے، اور جس کا ظلم اس کے عدل سے بڑھ کر رہا اس کے لئے دوزخ ہے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ عہدے کی طلب ناجائز نہیں ہے۔ لیکن اس ارشاد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا جو کچھ ہے اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی سے ملتے جلتے مضمون کی ایک اور حدیث بھی اس کے ساتھ ملائی جائے جو نسائی کے سوا تمام صحاح میں حضرت انسؓ سے منقول ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

من سأل القضاء وکل الیٰ نفسہ — جو شخص عہدۂ قضا خود مانگتا ہے وہ اپنے نفس کے حوالے

ومن جُبر علیہ ینزل علیہ ملک — کر دیا جاتا ہے۔ اور جو اس پر مجبور کیا جاتا ہے اُس پر ایک

یسدد ہ۔ — فرشتہ اترتا ہے جو اسے سیدھا چلاتا ہے۔

ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہاں جواز و عدمِ جواز یا کراہیت و استحباب کی بحث سرے ہی نہیں۔ دراصل جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ خود طلب کر کے عہدہ حاصل کرنے والا آدمی اپنے آپ کو اس خطرے میں مبتلا کر لیتا ہے کہ وہ توفیقِ الٰہی کے بغیر محض اپنے نفس کے بل بوتے پر حکومت کی بھاری ذمے داریاں سنبھالے۔ اب اگر وہ اس خطرے میں پڑ کر بھی راہِ راست پر چلتا ہے تو محض اس بنا پر وہ اجر سے محروم نہ کر دیا جائے گا کہ خدا اور رسول کے منع کرنے پر بھی وہ اس خطرے میں کود پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد کسی طرح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس فرمان کا ناسخ نہیں قرار دیا جاسکتا جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ "خدا کی قسم ہم اس حکومت کے کسی منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو خود اس کا طالب ہو یا حریص ہو۔"

(۴) حضرت عمرؓ کے اس فعل سے بھی استدلال کی کوشش کی جاتی ہے کہ انھوں نے خود اپنے اعتراف کے بموجب غزوۂ خیبر میں ایک موقع پر امارت کی تمنا کی تھی۔ اس واقعے کی جو تفصیل حدیث میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ خیبر کی جنگ میں ایک قلعہ پے در پے حملوں کے باوجود فتح نہیں ہو رہا تھا۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب میں یہ جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ما احببت الامارۃ الا یومئذٍ فتساورت لھا رجاء ان اُدعیٰ لھا۔ "مجھے کبھی امارت کی تمنا نہ ہوئی مگر اُس روز۔ میں اس کے لئے جھکا پڑتا تھا اس امید پر کہ میں اس کام کے لئے پکار لیا جاؤں۔" (مسلم۔ باب فضائل علیؓ)

یہ واقعہ خود اپنی شرح آپ کر رہا ہے۔ دیکھ لیجئے کہ یہاں حضرت عمرؓ امارت کی تمنا سے بیتاب ہو رہے ہیں یا ان کو بیتاب اس چیز کی تمنا کر رہی ہے کہ اللہ اور رسول کا محب جس شخص کو قرار دیا جانے والا ہے وہ عمرؓ بن خطاب ہو؟ تاہم اگر حضرت عمرؓ نے امارت ہی کی تمنا کی ہو تب بھی یہ بات نہ بھول جانی چاہئے کہ یہ تمنا کسی منفعت اور اقتدار کے منصب کے لئے نہ تھی بلکہ جان جوکھوں کے کام کی تھی، اور ایسے کاموں کے لئے آپ اپنے آپ کو

خود پیش کرنا نہ صرف جائز ہے، نہ صرف مستحسن ہے، بلکہ ایمان کی نشانی ہے۔ اس طرح کے مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم صحابہ کرام کے مجمع میں پکار کر فرمایا کرتے تھے "کون اس مہم کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے" اور صحابہ کرامؓ ایک دوسرے پر سبقت کرکے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔

(۵) بعض لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ کے معاملے کو بھی امیدواری کی نظیر میں پیش کرتے ہیں اور اس سے اس طرح استدلال فرماتے ہیں کہ گویا وہاں مختلف اشخاص منصبِ خلافت کے خواہشمند تھے اور ان کے درمیان انتخابی مقابلہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہاں بحث اس بات پر تھی ہی نہیں کہ امیدوار اشخاص میں سے کس کو منتخب کیا جائے اور کس کو نہ کیا جائے، بلکہ اس بات پر تھی کہ خلیفہ انصار میں سے ہو یا مہاجرین قریش میں سے۔ انصار وہ دلائل دے رہے تھے جن کی بنا پر اُن کے نزدیک انصاریوں کا حق مقدم تھا۔ مگر جب حضرت ابوبکرؓ نے مضبوط دلائل سے ثابت کردیا کہ قریش خلافت کے احق ہیں اور اُن کے ہوتے ہوئے عرب میں کسی اور کی خلافت کامیاب نہیں ہوسکتی تو انصار نے سرِ تسلیم خم کردیا۔ اس پورے گروہ میں صرف ایک حضرت سعد بن عبادہ ایسے شخص تھے جن کے اندر امیدواری کی بو پائی جاتی تھی، مگر سب کو معلوم ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا، نہ ان کی روش کو پسند کیا اور مرتے دم تک وہ منفرد ہی رہے۔

(۶) سب سے زیادہ جس چیز کا سہارا لے کر امیدواری کے جواز پر زور دیا جاتا ہے وہ حضرت علیؓ کی امیدواریٔ خلافت ہے۔ لیکن اول تو اس معاملے میں روایات مضطرب ہیں۔ ایک نوع کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنجناب اپنی ذات کے لئے خلافت کے مدعی نہ تھے بلکہ ان کی رائے یہ تھی کہ جب بنی ہاشم میں کوئی صالح اور اہل آدمی مل سکتا ہو تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کو منتخب کرنا درست نہیں ہے۔ اور دوسری قسم کی روایات، جو زیادہ مشہور رہی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ خود مدعیٔ خلافت تھے۔ پھر جو روایات آپ کے دعوائے خلافت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں ان سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے اس منصب کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی تھی، بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس کے خواہشمند تھے، اپنے آپ کو احق سمجھتے تھے، اور اس بات پر آزردہ رہے کہ لوگوں نے آپ کے حق کو نہ پہچانا۔ پھر انہی روایات میں ہم کو یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے آخر وقت میں جب چھ آدمیوں کی شوریٰ انتخاب خلافت کے لئے مقرر کی تو ارکانِ شوریٰ میں سے ہر ایک پر تنقید کرتے

ہوئے اس کی کمزوریاں بھی بیان کر دیں۔ منجملہ ان کے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

وما یمنعنی منک یا عثمان الا عصبیتک	اے عثمان! مجھے تم کو اپنا جانشین تجویز کرنے سے کوئی چیز
وحب قومک وما یمنعنی منک یا	نہیں روکتی مگر یہ کہ تم اپنے خاندان (بنی امیہ) کے لئے
علی الاحرص علیها وانک احری	تعصب رکھتے ہو اور ان کی محبت میں گرفتار ہو۔ اور
القوم ان ولیتها ان تقیم علی الحق	اے علی تم کو اپنا جانشین تجویز کرنے سے کوئی چیز مجھے
المبین والصراط المستقیم۔	نہیں روکتی مگر یہ کہ تم اس منصب کے خودخواہشمند ہو
(الامامة والسیاسة لابن قتیبہ۔ ص ۲۳)	ورنہ حق یہ ہے کہ اس پورے گروہ میں سب سے

بڑھ کر تم ہی ایسے آدمی ہو کہ اگر منصبِ خلافت پر مقرر کئے جاؤ تو ٹھیک ٹھیک حق اور راہِ راست پر قائم رہوگے۔

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلے میں یہ ہے کہ اگر صحابۂ کرام یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی، مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(۷) ایک کمزور سی دلیل اور بھی باقی رہ گئی ہے جسے جواب دیئے بغیر چھوڑ دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی ھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ "خدایا مجھ کو ایسی حکومت دے جو میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت کی تمنا کرنا پیغمبروں تک کی شان سے بھی گری ہوئی چیز نہیں ہے، کجا کہ ناجائز ہو۔ لیکن سورۂ ص کا تیسرا رکوع نکال کر دیکھ لیجئے۔ وہاں سلسلۂ کلام خود بتا رہا ہے کہ حضرت سلیمان نے یہ دعا فرمانروا ہونے کے بعد کی ہے نہ کہ اس سے پہلے، اور اس کا مدعا یہ تھا کہ خدایا مجھ کو بادشاہ بنا دے بلکہ یہ تھا کہ مجھے ایسی طاقت بخش جو میرے سوا کسی اور فرمانروا کو حاصل نہ ہو چنانچہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کو دیا وہ یہ تھا کہ ان کے لئے ہوا اور شیاطین کو مسخر کر دیا۔

انفرادی ملکیت اسلام میں

اسلام بحیثیت دین اور بحیثیت نظامِ حیات اپنے ہر پہلو میں انفرادی ملکیت کے اصول سے گہرے اثرات لئے ہوئے ہے۔ اس کا تصورِ ملکیت جیسا کچھ ہے اس کو جوں کا توں رکھ کر سوچئے تو اس کے تمام تفصیلی ضوابط کی ٹھیک ٹھیک توجیہ ہو سکتی ہے، لیکن اس کے تصورِ ملکیت کو مسخ کر دیجئے تو پھر اس کے تفصیلی ضوابط میں جگہ جگہ الجھاؤ اور تضاد واقع ہونے لگیں گے، اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ آپ پورے دین اور نظام کو بھی مسخ کر ڈالیں۔ اسلام کے تصورِ ملکیت کے لحاظ سے بہت سے انسانی افعال جرائم شنیعہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان جرائم پر گرفت کرنے کے لئے اس کے فوجداری ضابطے میں ایک مستقل سلسلۂ قانون شامل ہے، وہ: ملاک کے استعمال، اُن سے استفادہ اور ان کے تحفظ کے لئے کچھ حقوق اور حدیں قانون مقرر کرتا ہے اور سوسائٹی کو ان حقوق کی نگہداشت کا ذمہ دار بناتا ہے۔ پھر یہ اسلام کا مخصوص تصورِ ملکیت ہی ہے جس کے تحت بیع و شرا کا ضابطہ ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر اس تصورِ ملکیت سے قانونِ وراثت کی تشکیل ہوتی ہے اور یہی تصورِ ملکیت ہے جو زکوٰۃ و عشر اور اجتماعی مالیات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک سسٹم وجود میں لاتا ہے۔ اسی تصورِ ملکیت کے تحت فرد اور ریاست کے باہمی معاملات کی حدبندیاں ہوتی ہیں جو اسٹیٹ کو فرد پر ناجائز تصرف کرنے سے روکتی ہیں۔

چنانچہ اسلام کے قانونِ ملکیت کے تمام بنیادی اصولوں کی وضاحت کے لئے نصوصِ قطعیہ موجود ہیں، اور پھر ان اصولوں سے استنباط کردہ فقہی ضوابط اور قانونی نظائر کا ایک گراں بہا ذخیرہ موجود ہے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسلام کے اصولِ ملکیت یا قانونِ ملکیت کے بارے کوئی بنیادی غلط فہمی فروغ پا سکے۔ لیکن دورِ فتنہ کے مختلف کرشموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس اصولِ ملکیت پر نمایاں ذہنی انتشار برپا ہے۔

قومی ملکیت کا نظریہ اور متجددین

یہ بات کہ اسلام سے وفاداری رکھتے ہوئے، اس کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے، خود اس کے اصولوں پر غور و فکر کرتے ہوئے اور خود اسی کے عطا کردہ اصولِ اجتہاد کے تحت نو بہ نو تمدنی تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیشہ اہلِ علم نے قانونیات کے استنباطی پہلوؤں میں تصرّف کئے ہیں اور کئے جاتے رہیں گے، اور کئے جانے چاہئیں۔ لیکن یہ بالکل ایک الگ صورت حالات ہوتی ہے کہ آدمی اسلام سے باہر کسی دوسرے نظام کے اصولوں کو پسند کر کے آئے اور پھر مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ اس کھوج میں لگ جائے کہ اسلام میں تحریف کرنے کے لئے کہاں پاؤں جمانے کی جگہ ملتی ہے۔ پھر اسلام کے پورے سسٹم کی نوعیت سے آنکھیں ہٹا کر صرف ان جزئیات کو تلاش کیا جائے کہ جنھیں اگر سارے سسٹم سے الگ کر کے تاویل کے خراد پر چڑھایا جائے تو وہ باہر سے "درآمد کردہ" اصولوں پر منطبق ہو سکیں، اور پھر اعلان کر دیا جائے کہ یہ اصول تو ہمیشہ سے عین اسلامی تھے؛ محض ملاؤں نے سازش کر کے ان کو اسلامیات سے نکال باہر کر دیا۔

یہ صورتِ حالات آج اسلام کو سیاست میں بھی، معاشرت میں بھی اور معاشیات میں بھی درپیش ہے، سیاست میں اربابِ تجدد یہ ثابت کر رہے ہیں کہ امریکی جمہوریت کا نظام اسلامی ہے؛ معاشرت میں وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مغرب کی بے پردہ ——— بے پردہ ہی نہیں، بے حیا ——— معاشرت اسلام کی معاشرت ہے، اور اسی طرح معاشیات کے دائرے میں کچھ لوگ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ مارکس کا قومی ملکیت کا اصول تو اول اول اسلام ہی نے پیش کیا تھا اور صحابہ کی سوسائٹی عین اسی اصول پر استوار ہوئی تھی، اور تمام معاشی مفاسد کا حل اسی اصول میں ہے۔ اس دعوے کے لئے استدلال کی بنیاد کبھی الارض للہ پر کھڑی کی جاتی ہیں، کبھی لیس للانسان الا ما سعی پر، اور کبھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، کے نظریہ کفاف کو سامنے لایا جاتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس سارے استدلال میں کتنی مغالطہ انگیزیاں شامل ہیں، یہ طرزِ فکر بجائے خود مجرمانہ ہے کہ پورے سسٹم کو اور اس کے مزاج کو دیکھے بغیر اس کے اندر سے دو ایک اجزاء کو نکال لیا جائے۔

"قومی ملکیت" کا نظریہ اصولی حیثیت سے اسلام سے منافات رکھتا ہے۔ اس نظریے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان سرمایہ و دولت اور معاشی ذرائع و وسائل کا مالک رہتے ہوئے "صالح" نہیں ہو سکتا، بلکہ ملکیت

اسے لازماً معزز و مفسد بنا کے چھوڑتی ہے، لہٰذا اگر اسے شر سے باز رکھنا ہو تو اس سے سلبِ ملکیت ضروری ہے۔ اسلام بخلاف اس کے انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے، بلکہ وہ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ آدمی کا اصل فسادِ ملکیت کے سرچشمے سے نہیں بلکہ ذہنیت اور سیرت کے سرچشمے سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ذہن و سیرت کی صحت درست ہو جائے تو "ملکیت" انسانی ہاتھوں میں تمامتر آئنِ خیر بن سکتی ہے۔ پس اس کی اسکیم "سلبِ ملکیت" کے بجائے اصلاحِ فکر اور تعمیرِ سیرت کے پروگرام پر مشتمل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایک الگ راستہ ہے اور یہ ایک جداگانہ راہِ عمل ہے۔ یہ راستے پہلے قدم پر ہی باہم الگ ہو جاتے ہیں، اور جتنا جتنا آگے بڑھتے ہیں، اتنا ہی اتنا دور ہوتے جاتے ہیں۔ دونوں میں تطبیق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن مرعوبیت اور تقلید زدہ ذہنیت وہ بدبلا ہے کہ وہ ہر قسم کی حماقت کر گزرتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں مارکسزم کا پیوند لگانے کی کوشش آپ کے سامنے ہو رہی ہے۔

قومی ملکیت کے اصول کو ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے استدلال سامنے آرہے ہیں، لیکن ان میں سے دلچسپ ترین استدلال یہ ہے کہ سب کچھ تو خدا کی ملکیت ہے، لہٰذا انسانی افراد کا دعوائے ملکیت بے معنیٰ ہوا، اب جب افراد کا دعوائے ملکیت ساقط قرار پایا تو پھر باقی اسٹیٹ ہی رہ جاتا ہے کہ وہ مدعی بنے؛ اس کو مدعی بننے کا حق اس وجہ سے ہے کہ وہ نائبِ خدا ہے۔ یعنی خدا کی ملکیت کا سوال اٹھا کر اس سوال کے ذریعے فرد کو تو میدان سے ہٹا دیا اور اسٹیٹ کو خدا کے سے حقوق دے دیئے ———— حالانکہ فرد بھی نائبِ خدا تھا۔ اس سارے استدلال میں اصل مغالطہ الٰہی ملکیت اور انسانی ملکیت کی نوعیت میں امتیاز نہ کرنے کا ہے۔ نہ اُس ملکیت کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے، نہ اِس کا، اور اس طرح ایک دلچسپ منطق نمودار ہوتی ہے۔ ان مغالطہ انگیزیوں کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ملکیت کی حقیقت و ماہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جیسی کہ وہ اسلام میں ہے۔

الٰہی ملکیت اور انسانی ملکیت

از روئے اسلام تمام موجودات حتیٰ کہ خود انسان اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ یہ بات صرف سرمائے، زمین اور کاروباری وسائل ہی کے لئے خاص نہیں، بلکہ انسان کا جسم، اس کے قویٰ، اس کی قوتِ ارادی، اس کا علم، اس کے جذبات سب کچھ ملکِ الٰہی میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حقِ ملکیت کے امتیازات یہ ہیں:۔

(۱) مجردِ تخلیقِ شے ہی سے اللہ تعالیٰ کی ملک اُس پر قائم ہو جاتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی ملکیت تکوینی طور پر از خود قائم ہے اور وہ اسے کسی دوسری قوت سے تسلیم کرانے کا پابند نہیں ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی ملکیت کامل ہے اور وہ اپنی املاک میں جو جو تصرف چاہے کر سکتا ہے، اسے کوئی دوسرا روکنے والا نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی موجودات ملکیت "ملکیت برائے استفادہ" نہیں، بلکہ نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ خود ہی مالک ہے اور خود ہی اپنے حقوقِ ملکیت کے استعمال کا ضابطہ بناتا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی ملکیت ناجائز ہے، نہ کسی ملکیت میں اس کا کوئی تصرف ناجائز ہو سکتا ہے۔

بخلاف اس کے از روئے اسلام انسانی ملکیت کی نوعیت مختلف ہے اس کے امتیازات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) انسانی ملکیت امانتی ہے کہ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے کچھ حدود و ضوابط کے تحت انسانوں کو اپنی امانات تفویض کی ہیں۔ ان حدود و ضوابط کے اندر جو ملکیتیں قائم ہوتی ہیں، وہ جائز قانونی ملکیتیں ہیں اور جو ان حدود سے باہر عملاً (DE-FACTO) قائم ہو جائیں وہ قانونِ الٰہی کی رو سے ناجائز ملکیتیں ہیں۔

(۲) انسانی ملکیت کے حق کا قائم ہونا اور قائم رہنا اس بات پر بھی منحصر ہے کہ انسانی معاشرہ اس حق کو تسلیم کرنے اور اس کی حفاظت کرنے پر تیار ہو۔ اس لحاظ سے انسانی ملکیت کا معاملہ سیاسی و اخلاقی نوعیت کا ہے تکوینی نوعیت کا نہیں۔

(۳) انسانی ملکیت بہت محدود ہے، کیونکہ آدمی اپنی املاک میں صرف اس حد تک تصرفات کر سکتا ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ کے تکوینی ضابطے اس کو موقع دیتے ہیں۔ ان ضابطوں کی دی ہوئی آزادی سے باہر انسان اپنی املاک کے بارے میں اتنا ہی بے بس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کوئی مالکانہ حقوق نہ رکھتے ہوئے ہوتا۔

(۴) انسان احتیاجات کے لئے ملکیت چاہتا ہے۔

(۵) انسانی ملکیت عارضی ہوتی ہے[1]۔ موت اس کا تعلق املاک سے منقطع کر دیتی ہے، اور عام ضروریات و حوائج بھی اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنے املاک کا دوسروں سے تبادلہ کرتا رہے۔

---

[1] جیسے کہ حق تعالیٰ نے انسانی املاک کو متاع الیٰ حین فرمایا۔

(۴) انسان اپنے حقوقِ ملکیت اور املاک کے استعمال کے لئے از روئے حق ضابطہ سازی کا مجاز نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لئے ضابطہ سازی کا منصب اصل مالک کا ہے۔ اس اصول کی وجہ سے عملاً دو قسم کے رویّے پیدا ہو جاتے ہیں: ایک رویّہ یہ کہ انسان الٰہی ضابطۂ ملکیت کو معلوم کر کے اُس پر چلے اور دوسرے یہ کہ اپنے لئے خود ضابطۂ ملکیت بنائے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ضوابط میں سے کسی کی پیروی کر لے۔ پہلا رویّہ اسلام کی نگاہ میں واجب القبول اور دوسرا انتہائی قابلِ اجتناب ہے۔

انسانی حق ملکیت کے بارے میں اصل سوال

انسانی ملکیت کے مسئلے میں جہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ انسانی ملکیت خدا تعالیٰ کے بالمقابل کیا نوعیت رکھتی ہے، وہاں اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرد کا حقِ ملکیت دوسرے افرادِ انسانی (اور اسٹیٹ) کے بالمقابل کس حیثیت کا حامل ہے؟ یہی وہ اصل سوال ہے جسے صاف کئے بغیر پُرپیچ بحثیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسان کے مقام اور مرتبے کا تعلق ہے، وہ بالکل متعین ہے۔ آدمی خدا کا عبدِ مملوک اور اس کا نائب و پیش کار ہے اور خود اس کے دل و دماغ سے لے کر زمین و آسمان اور ضروریاتِ زندگی ہر چیز تک جو کچھ بھی موجودات ہیں سب کی سب اللہ کی ملک اور استفادہ کے لئے اس کی طرف سے عطا کردہ ہیں پس اللہ کے سامنے تو انسان کی مالکانہ حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ ایک عبدِ صالح:

ہر وقت یہ احساس کرے کہ وہ اپنی املاک کا مالک نہیں، امین ہے۔

صرف ان املاک پر اکتفا کرے جو قانونِ الٰہی کی رو سے جائز ہوں، اور کسی ایسی چیز میں تصرف نہ کرے جس پر الٰہی ضابطے کی رو سے اس کا جائز حق قائم نہ ہوتا ہو۔[۵۲]

اپنی املاک کو صرف اُن مقاصد کے لئے اور صرف اُن طریقوں سے استعمال کرے جو قانونِ الٰہی کی رو سے جائز قرار پاتے ہوں۔[۵۳]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی املاک میں دوسرے افراد اور نظامِ اجتماعی کے جو جو حقوق واجب ٹھیرائے

---

۵۲ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ (القرآن) ۵۳ کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔

گئے ہوں، ان کو برضا و رغبت ادا کرے (بلکہ رضائے الٰہی کے لئے قانونی حقوق سے آگے بڑھ کر جتنی زیادہ سے زیادہ قربانیاں دے سکتا ہو دے[۵۱])

خدا نے اُس کی طرح دوسرے انسانوں کو ان کی املاک پر جو حقوقِ ملکیت دے رکھے ہیں اُن کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھے۔[۵۲]

املاک کی کمی اور املاک کی زیادتی دونوں کو اپنے لئے آزمائش سمجھے کہ نہ اُس حالت میں تذلل اور چھچھورپن پر اتر آئے، اور نہ اس حالت میں کبر اور استبداد کی روش اختیار کرلے ——— بلکہ اُسے مقام صبر اور اِسے مقام شکر سمجھے!

اپنی تمام تر جدوجہد کو اموال و املاک کے سمیٹنے اور ان میں اضافہ کرنے کے لئے خاص نہ کر دے، بلکہ قوت اور وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ زندگی کے اصل مقصد یعنی عبادتِ حق تعالیٰ پر صرف کر دے اموال واملاک پر اتنی توجہ دے جتنی ناگزیر ہے۔[۵۳]

لیکن اب سوال سامنے آتا ہے دوسرے افرادِ انسانی (اور اسٹیٹ) کے مقابلے میں انسان کے قانونی حقِ ملکیت کا!

آپ ذرا غور فرمایئے کہ کیا چور کسی کے مال کی چوری کرتے ہوئے یہ استدلال کر سکتا ہے کہ مال تو سارا اللہ کا ہے، میں اگر اس میں سے لے لوں تو کسی کو روکنے کا کیا حق! ایک جیب تراش کہہ سکتا ہے کہ جیب اور اس کے اندر کے سکے تو اللہ کی ملک ہیں، پھر اگر میں جیب کترنے کے لئے اڑوں تو خدا کے سوا کسی اور کو ڈانٹ ڈالنے کا کیا اختیار ——— آپ کہیں گے ہرگز نہیں! یہ استدلال تو احمقانہ ہے!

---

۵۱ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا ... الخ نیز آیت "ومما رزقنٰھم ینفقون"۔ والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔ یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو!

۵۲ ولا تتمنوا ما فضل اللہ بعضکم علی بعض۔

۵۳ انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو ... الخ (الفرقان) افلح من کان ، سلم کان رزقہ کفافا (حدیث)،

مگر کیوں؟

اس لئے کہ خدا نے خود ایک شخص کو محدود حقوق مالکانہ تفویض کر دیئے ہیں اور ان کے متعلق ایک اخلاقی ضابطہ متعین فرمادیا ہے۔ اب ذرا مزید سوچئے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں انسان کے حقوق مالکانہ کی نوعیت کیا ہے؟

دراصل انسان کے اندر "انا" کا جو طبعی احساس پایا جاتا ہے، ملکیت کی ساری اہمیت اسی کے محور پر گردش کرتی ہے۔ ایک بچہ جونہی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ کچھ آلات واعضا ایسے رکھتا ہے جن پر اسی کا اپنا ارادہ حکمران ہے تو اس احساس سے ملکیت کا شعور جنم لیتا ہے، اور پھر برابر نشوونما پاتا چلا جاتا ہے۔ جو چیز آدمی میں "میں" "تم" اور "وہ" کا امتیاز پیدا کرتی ہے، وہی اس میں "میرا" "تمہارا" اور "اس کا" امتیاز بھی پیدا کر دیتی ہے۔ ایک آدمی جس طرح بے بس ہے کہ "میں" اور "تم" کو الگ الگ پہچانے، اسی طرح وہ بالکل غیر اختیاری طور پر "میرا" اور "تمہارا" کے درمیان بھی خطِ فاصل کھینچتا ہے۔ پھر اس میں "میں" اور "میرا" کی حس "میری محنت" "میری کوشش" "میری کمائی" وغیرہ کے تصورات کو وجود دیتی ہے اور ان سارے تصورات کے مجموعی اثر سے "میری ملکیت" کا ایک جامع شعور نمودار ہوتا ہے، بلکہ اس کی ایک زوردار خواہش بھی ظہور پاتی ہے۔ یہی شعور اور یہی خواہش ہے جو جائداد (PROPERTY) ہی کو نہیں، بلکہ "گھر" "خاندان" "ربطِ زوجیت" اور کنبے کی وحدت کو بھی وجود دیتی ہے۔ اس طرح انسانی "انا" اور جذبۂ ملکیت پورے تمدن کی رگوں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔

اس فطری جذبے کا زور اتنا زیادہ ہے کہ آدمی کو اگر آپ اس کی ساری املاک سے الگ کر دیں تو چاہے تمام سہولتیں آپ اسے بہم پہنچا دیں، اطمینان اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ اسے گھر سے نکال کر اچھے سے اچھے ہوٹل میں جا بسائیے، یا اپنے پاس بطور مہمان ٹھہرا لیجئے، وہ (AT HOME) ہونے کی کیفیت سے محروم رہے گا۔

دراصل ملکیت کے جذبے کی جڑیں جذبۂ آزادی اور جذبۂ اختیار سے سیراب ہوتی ہیں۔ آدمی اس بات کا طبعاً ضرورت مند ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممکن حدود میں آزاد ہو اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ کچھ اس کا اپنا ہونا چاہئے جس کو وہ جس طرح چاہے استعمال کرے۔ وہ اپنے ذوق، اپنے رجحان، اپنی عادات، اپنی حیثیت

اپنی داخلی تحریکات کو ظہور دینے کے لئے فطری طور پر ایک ہمہ گیر میلان اپنے اندر لے کے پیدا ہوا ہے۔ یہی میلان بنیاد ہے گھر کی، خاندان کی، نکاح کی، اور ملکیت کی۔ اس میلان کے لئے بیرونی مداخلتوں سے آزاد ایک "سلطنت" چاہیے جہاں آدمی اللہ کی نیابت کے سوا اور کسی کا پابند نہ ہو، اور یہ سلطنت اصولِ ملکیت سے وجود میں آتی ہے۔ دوسروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس سلطنت کو جہاں تک محدود کرنا ناگزیر ہو وہاں تک قانون اور اخلاق کے جنگلے لگا دیجئے، لیکن ان جنگلوں کے اندر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ یہاں اگر بیرونی تسلط اپنا پرتو ڈالے گا تو انسانی سکون و اطمینان غارت ہو جائے گا۔

یہ ہے انسانی جذبۂ ملکیت کی ماہیت، اور اسی جذبے کے تقاضوں کے مطابق اللہ کے قانون نے ——— اور اسی قانون سے متاثر شدہ انسانی قانون نے بھی ——— انسان کے لئے خدا کی تکوینی ملکیت کے تحت سوشل اور سیاسی حیثیت سے حقوقِ ملکیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کی کچھ حد بندیاں کی ہیں۔ یعنی انسان کے حقوقِ ملکیت بمقابلہ دوسرے انسانوں کے مقرر کئے ہیں۔ ان حقوق کا مرکزی مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ افراد کے لئے جائز املاک کے بارے میں یہ حق تسلیم کیا جائے کہ ان کے قبضہ و استعمال کی جائز صورتوں میں کوئی دوسرا مداخلت نہیں کرے گا ——— نہ فرد، نہ اسٹیٹ، نہ کوئی اور۔ حقوقِ ملکیت کی اہمیت اتنی شدید ہے کہ آج کی تمام مہذب ریاستیں اپنے دستور میں ان کی حفاظت کی گارنٹی دیتی ہیں، اور تو اور، خود اشتراکی ریاست بھی مقابلۃً محدود دائرے میں ان حقوق کی حفاظت کی گارنٹی دینے پر مجبور ہو چکی ہے۔

ان حقوقِ ملکیت کو جائز حدود میں اسلام نے ہر دوسرے نظامِ زندگی کے مقابلے میں زیادہ وسعت اور فراخی کے ساتھ قائم کیا ہے اور ان کی حفاظت کی گارنٹی دی ہے[1]۔ اس گارنٹی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کی تکوینی

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اس گارنٹی کو قطعیت کے ساتھ بطور آخری وصیت کے بیان کیا کہ تمہاری جانیں اور تمہارے اموال و املاک ایک دوسرے پر اسی طرح حرام کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تمہارا یہ شہر حرمت والا ہے اور جس طرح تمہارا یہ دن حرمت والا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں اسی گارنٹی کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اپنے نائب امرا کو یہ اختیارات نہیں دیئے ہیں کہ وہ تم پر جبر کریں، اور تمہارے اموال غصب کریں، بلکہ میں نے ان کو ائمۂ ہدیٰ بنا کر بھیجا ہے۔

اور اساسی ملکیت کی نفی کی جارہی ہے، بلکہ یہ انسان کی امانتی ملکیت ہی کے تحفظ کا سامان ہے۔ "امانتی ملکیت" کا تصور اسلام میں اتنا بودا نہیں ہے کہ کوئی فرد، جماعت اور پارٹی، حکمران اور لیڈر، وزارت اور اسمبلی اٹھے اور انسانی ملکیتوں کو یہ کہہ کر کالعدم قرار دیدے کہ ملکیت حقیقی تو اللہ کی ہے، انسانوں کو کیا حق کہ وہ امانتی ملکیت پر اجارہ جمالیں؟ اگر کوئی طاقت ایسا کرتی ہے تو وہ گویا خدا کے مقرر کردہ امانت داروں کو ان کی جگہ سے ہٹاتی بھی ہے اور خود کو اٹھا کر خدا کے مقام پر بھی جا پہنچاتی ہے۔ اس استدلال سے تو خدا کی عطا کردہ امانتی ملکیت پر ہی خط تنسیخ پھر جاتا ہے۔

انفرادی ملکیت اور اجتماعی ملکیت اسلام نے دولت کی بعض غیر اکتسابی اقسام کو قطعی طور پر غیر ملکیتی قرار دیا ہے، مثلاً ہوا، پانی، سورج کی روشنی وغیرہ۔ لیکن باقی ملکیتی دولت کی جتنی اقسام بھی رہ جاتی ہیں، وہ سب کی سب اولاً افراد کی انفرادی ملک بنتی ہیں، بعدہٗ اس کا موقع آتا ہے کہ افراد اپنی املاک کے بعض اجزاء کو اجتماعی ضروریات کے لئے اسٹیٹ کی تحویل میں دیں۔

افراد جس طرح خدا کی طرف سے براہ راست خلافت و نیابت کا منصب پاتے ہیں اور پھر اپنے امانتی اختیارات کو اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں تو حکومت وجود میں آتی ہے، بالکل اسی طرح امانتی ملکیت بھی براہ راست افراد کو حاصل ہوتی ہے اور پھر وہ اپنی انفرادی املاک کے بعض اجزا کو اجتماعی ضروریات کے لئے ریاست کے حوالے کرتے ہیں ــــــــ جس کے نتیجے میں "بیت المال" یا "خزانہ" وجود میں آتا ہے۔

پس اسلامی فلسفۂ ملکیت کے لحاظ سے خدا کے بعد پہلا مقام فرد کا ہے، نہ کہ ریاست کا! ریاست ملکیت کے اعتبار سے قانونی حیثیت رکھتی ہے۔ فرد صرف اللہ کے سامنے امانتدار کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اسٹیٹ خدا اور افراد دونوں کے سامنے امانتدارانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اندریں احوال یہ کام اسٹیٹ کا نہیں کہ وہ افراد کی ملکیتوں میں جو تصرف چاہے کرے، بلکہ یہ کام افراد کا ہے کہ وہ اپنی ملکیتوں میں تصرف کرنے کا حق جتنا بھی چاہیں اسے دیں۔

لیکن اس معاملے میں اسلام نے فرد اور اسٹیٹ کو معرضِ کشمکش میں نہیں چھوڑ دیا، بلکہ فرد کے حقوقِ مالکانہ اس کے قانون میں صراحۃً متعین ہیں، اور اسلامی اسٹیٹ از روئے دستور ان حقوق کی حفاظت کرنے پر مامور ہے۔

اسلام میں حقوقِ مالکانہ اسلامی قانون کی رو سے کسی شئے پر مالک کو جو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حقِ قبضہ ـــــ ایک شئے کے مالک کا اولین حق یہ ہے کہ وہ اپنی مملوکہ شئے پر اپنا قبضہ قائم رکھے۔ کوئی دوسرا اگر اس کا قبضہ اس کی رضا کے بغیر ہٹانا چاہے تو وہ اس کی مزاحمت کرے! چنانچہ اسلام نے حفاظتِ مال کی جدوجہد میں مارے جانے والے کو "شہید" کا مرتبۂ بلند عطا کیا ہے اور ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ دوسرے بھائیوں کی املاک کے حقِ قبضہ کو بچانے میں ان کی مدد کرے۔

قبضے کا یہ حق جس طرح روپے، پیسے، برتنوں، چارپائیوں، مکانوں اور موٹروں پر دیا گیا ہے، اسی طرح کارخانے، آلات، زمین وغیرہ پر بھی دیا گیا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی شخص کسی شئے کو مستثنیٰ کرنا چاہے تو وہ صریح قانونی سند فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ اور الارض للّٰہ سے جو استدلال کئے جاتے ہیں وہ اس قسم کی کوئی سند فراہم نہیں کرتے۔

حقِ قبضہ صرف اس صورت میں ناقابلِ تسلیم ہوتا ہے جب کہ وہ کسی جائز اخلاقی و قانونی بنیاد پر حاصل نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً کوئی مال چوری کر کے دوسرے کے قبضے سے نکالا گیا ہو تو اس پر قابض ہونے والے کو قانون مالکانہ حقوق نہیں دے گا۔

(۲) حقِ استعمال ـــــ دوسرا مالکانہ حق ایک مالک شئے کا یہ ہے کہ وہ اس کو اسلام کی جائز کردہ تمام صورتوں میں سے جس میں چاہے استعمال کرے، اور کوئی اس میں مانع نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص پیالے میں پانی پینا چاہے تو پئے اور سالن ڈالنا چاہے تو ڈالے، اور دوا گھولنا چاہے تو گھول سکے۔

کسی شئے کا صرف وہ استعمال ممنوع ٹھیرایا جا سکتا ہے جسے قانون نے اخلاقی مفسدات کی وجہ سے حرام کر دیا ہو۔ مثلاً تلوار کو ناحق کسی کے قتل یا قطعِ اعضا کے لئے استعمال کرنا! اسی طرح بر سر عام جن املاک کے استعمال کے لئے کچھ قواعد ضوابط مقرر کئے گئے ہوں، ان کو توڑ کر غلط استعمال کرنا بھی ممنوع ہوگا۔ مثلاً موٹر گاڑی کو سڑک پر بائیں ہاتھ چلانے کے بجائے دائیں ہاتھ چلانا یا رات کی تاریکی میں بغیر بتی سائیکل چلانا[1] وغیرہ!

---

[1] ایسے معاملات میں دراصل بیک وقت دو پہلو پائے جاتے ہیں! ایک طرف تو انفرادی ملک میں آئی ہوئی گاڑی یا سائیکل کا مسئلہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اجتماعی ملک سے تعلق رکھنے والی سڑک کے استعمال کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ انفرادی ملک پر ان مواقع پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہ کسی اجتماعی ملک کے استعمال کے تقاضوں کے تحت عائد ہوتی ہیں۔ ورنہ بجائے خود انفرادی ملک ان پابندیوں کی مقتضی نہیں ہوتی۔

(۳) حقِ تصرف — یہ ایک مالکانہ حق ہے۔ اس سے منشا یہ ہے کہ مالک اپنی چیز میں جو رد و بدل چاہے کر سکے۔ مثلاً وہ اپنے کمرے کا نقشہ بدل ڈالے، وہ فرنیچر کو جس ترتیب سے چاہے سجائے، وہ اپنے باغ کو چاہے تو چراگاہ میں بدل دے اور چاہے تو کھیلنے کا میدان بنا دے، وہ تہبند کو کتر کر پاجامہ یا شلوار بنا ڈالے۔ وہ روئی کے ڈھیرے کو سوت میں اور سوت کو کپڑے کی شکل میں بدل ڈالے۔ کسی شخص اور خود اسٹیٹ کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ایک مالک سے حقِ تصرف سلب کر لے — الا یہ کہ خود تصرف ناجائز قسم کا ہو، مثلاً انگور سے شراب بنانا یا پتھر سے بت تراشنا وغیرہ

اضاعتِ مال کا حق بھی شریعتِ اسلامیہ نے افراد کو نہیں دیا ہے۔

(۴) حقِ انتفاع — اس حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مالک اپنی ہر ملکیت کو نفع حاصل کرنے کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ یہ بات بجائے خود قانون میں طے ہے کہ نفع اندوزی کے کونسے دروازے کھولنا ممنوع ہے لیکن فی نفسہ نفع اندوزی کے لئے کسی بھی ملکیت کو استعمال کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ روپے والا اپنے روپے کو تجارت میں لگا کر، زمین والا کاشت کر کے، ذہین آدمی اپنے دماغ سے کام لے کر اگر سوسائٹی کی کسی خدمت کے بدلے میں "آمدنی" پیدا کرتا ہے تو اسلام اس میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔

رکاوٹ صرف نفع اندوزی کے ان راستوں میں ڈالی گئی ہے جو اخلاقاً مفسدہ انگیز ہیں۔ مثلاً اگر کوئی صاحبِ سرمایہ اپنا سرمایہ شراب اور آلاتِ موسیقی کے کاروبار میں لگائے، کوئی فاحشہ اپنے جسم کو کرائے پر چڑھائے، کوئی ساہوکار روپے کو کرائے پر چڑھائے اور سود وصول کرے، کوئی تاجر دھوکے اور فریب پر کاروبار چلائے، تو اس قسم کی متعین صورتوں کو اسلام حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن ان متعین حرام صورتوں کے علاوہ وہ کسی مالک کو حقِ انتفاع سے محروم نہیں کرتا۔[1]

انتفاع سرمائے سے ہو، زمین سے ہو، مشین کے ذریعے سے ہو، دماغی قویٰ کے بل پر ہو، ہاتھ پاؤں سے

۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوسط درجے کے حالات میں تاجروں کی نفع اندوزی پر کوئی قانونی حد بندی یا جبر عائد کرنے سے احتراز فرمایا ہے، اور اس معاملے کو اخلاقی تربیت پر چھوڑا ہے۔ کیونکہ منافع پر حد بندی ایک مالکانہ حق کو مجروح کرتی ہے۔ خاص حالات کا معاملہ جداگانہ ہے۔

کام لینے کی صورت میں ہو ــــــ تمام جائز املاک پر یہ حق مالک کو حاصل ہے۔

(۵) حق کرایہ ـــــ حق کرایہ سے مراد کسی چیز کے حقِ استعمال اور حقِ انتفاع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا ہے۔ جیسے مکان، سائیکل، یا کھیل کے میدان کو کرائے پر دینا، جیسے بس کی سیٹوں کو مسافروں کے لئے بک کرنا، جیسے زمین کو کسی لگان کے عوض کاشت کرنے کے لئے دینا، وغیرہ۔ یہ حق حقِ انتفاع میں ضم ہو سکتا ہے، لیکن اسے جداگانہ طور پر متعین کرنا ضروری معلوم ہوا۔

اس معاملے میں بھی چند متعین قیود ہیں، مثلاً زمین کو مُذیانات کے طریق پر کاشت کے لئے دینا، نقد روپے کو اصولِ ربوا کے تحت کرائے پر چڑھانا وغیرہ امور ممنوع ہیں لیکن اس طرح کی چند پابندیوں کے بعد باقی کے میدانِ اباحت میں نہ کوئی فرد دخل دینے کا مجاز ہے نہ اسٹیٹ۔

(۶) حق پس اندازی ـــــ اسلام کے قانون نے فرد کو اپنی آمدنی میں مستقبل کی ضروریات، مثلاً تعمیرِ مکان، شادی بیاہ، اسبابِ ضروریہ کی فراہمی، ادائے قرض، بیماری کے معالجے، ناگہانی حوادث کے مقابلے کے لئے پس انداز کرنے کا حق بھی دیا ہے۔ بچتوں (العفو) کو خود قرآن نے جائز ٹھیرایا ہے۔

"اکتناز" پر جو وعید آئی ہے وہ دو صورتوں سے متعلق ہے۔ ایک یہ کہ اندوختے ناجائز ذرائع سے جمع کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ ان میں سے واجب الادا حقوق ادا نہ کئے جائیں۔

(۷) حقِ اضافہ ـــــ یہ حق بھی حقِ انتفاع میں ضم ہو سکتا ہے، لیکن انتفاع کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ ایک شخص نفع کی آمدنی حاصل کرتا رہے۔ رہا اس بات کا حق کہ وہ اپنی آمدنی پوری کی پوری یا اس کا کوئی حصہ اپنی جملہ ملکیت یا خاص نفع آور ملکیت میں المضاعف کر سکتا ہے، بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔

اشتراکی اسٹیٹ افراد کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اپنی آمدنیوں کو نفع آور ملکیتوں میں شامل کر کے ان میں اضافہ کرنے کے مجاز ہیں، بلکہ وہ لازم ٹھیراتا ہے کہ آمدنیاں صرف اشیائے صرف پر لگائی جائیں۔ اسلام میں اس قسم کی کوئی تحدید ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کا نشان نہیں ملتا۔ پھر اشتراکیت زدہ دماغوں ہی کی پیداوار "تحدیدِ املاک" کا نظریہ ہے۔ یعنی یہ لوگ املاک، خصوصاً نقدی اور زمین ـــــ کے بارے میں لازم سمجھتے ہیں کہ تمام افراد کے لئے ملکیت کی ایک مقداری حد معین کر دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں افراد کو اپنی املاک کے لئے جو حق اضافہ

حاصل ہے، اسے بڑی حد تک ختم کرا دیا جائے۔ اسلام کو ان من گھڑت فلسفوں سے کوئی تعلق نہیں۔

(۸) حقِ شراکت ـــــــ ایک مالک کو اسلام کی طرف سے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے املاک میں یا ان کے حقِ استعمال اور حقِ انتفاع میں جس قسم کے جائز معاوضے اور جائز شرائط پر چاہے دوسروں کو شریک بنا لے۔ وہ اپنے مکان کی ملکیت میں کسی قیمت کے بدلے میں اپنے بھائی کو شامل کر سکتا ہے، وہ اپنی تجارت و صنعت میں مناسب شرائط پر دوسروں کو حصہ دار بنا سکتا ہے، وہ اپنی زمین کی پیداوار میں اپنے مزارع[له] کے لئے اس کی محنت کے عوض کسی تناسب سے حقِ شرکت تسلیم کر سکتا ہے، وہ اپنے کاروبار میں کسی کارکن کی محنت کو اس تجویز پر استعمال کر سکتا ہے کہ دونوں کاروبار کے منافع میں فلاں تناسب سے شریک ہوں گے۔

اس میں مالک کو صرف اسلام کے حدودِ اخلاق اور اس کی قانونی بندشوں کا احترام کرنا واجب ہے، لیکن اسے ریاست اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ وہ اپنی املاک یا ان کے حقِ انتفاع میں کسی کو حصہ دار نہ بنائے، بلکہ ان کو خود ہی استعمال کرے یا ان سے تنہا خود ہی استفادہ کرے۔ اس قسم کی بے معنی پابندی کا سراغ اسلام میں نہیں ملتا۔

له کہا جاتا ہے کہ زمین کے بارے میں حصہ داری پیداوار کے اصول پر کوئی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ پیداوار نہ ہو اور مزارع بھوکا رہے لیکن کیا تجارت و صنعت میں اصولِ مضاربت کے تحت (جو خود اصولِ مزارعت ہی کی بنا پر مدوّن کیا گیا ہے) خسارے کی صورت میں "کارکن" کو یہی صورت پیش نہیں آتی جو مزارع کو آ سکتی ہے؟ پھر کس بنا پر وہاں ایک صورت جائز ہے اور یہاں ناجائز؟ علاوہ بریں یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مالکِ زمین کی ملکیت اگر محدود ہو تو فصل نہ ہونے سے وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرض لینے یا زمین فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خصوصاً اسلام میں جو عورت کو مردوں کے ساتھ حقِ وراثت دلواتا ہے، اس کا امکان ہے کہ ایک بیوہ عورت اور اس کے یتیم بچوں کے حصے میں جو زمین آتی ہو اسے وہ کسی سے کاشت کرانے پر مجبور ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ اجرت دے کر کاشت فرما کرائے لیکن اگر وہ زمین کے سوا کوئی سرمایہ نہ رکھتی ہو تو پھر کیا کرے؟ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ وہ زمین بیچ ڈالے یہ کوئی حل تو نہ ہوا کہ وہ ایک مستقل ذریعۂ رزق دے کر وقتی ضروریات پوری کرے۔ دراصل تمدنی حالات کی گوناگونی کے پیشِ نظر اسلام نے ہر معاشی معاملے میں متعدد صورتیں جائز ٹھیرا دی ہیں تاکہ اگر ایک قابلِ عمل نہ ہو تو دوسری سے کام لیا جائے۔ جس طرح ایک صاحبِ سرمایہ اپنے سرمائے کو شراکتِ منافع کے اصول پر کسی کارکن کے حوالے کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ہر ایک صاحبِ زمین اپنی زمین کو شرکتِ پیداوار کے اصول پر کسی کاشتکار کے سپرد کر سکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ٹھیک ایک دوسرے کی بالکل مشابہ ہیں اور ان دونوں کو معاشیاتی نقطۂ نظر سے ایک ہی نوعیت حاصل ہے۔ اسلامی قانون بھی ان دونوں کو یکساں جائز ٹھیراتا ہے۔

اشتراکی معاشیات میں املاک کے لئے مالکوں کا حقِ شراکت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہاں ایک شخص اگر خرید کر کسی اکیاں کی مشینت اس شرط پر حاصل نہیں کر سکتا کہ دونوں اس کی آمدنی میں کسی تناسب سے شریک ہو جائیں گے۔ بس وہ اگر خرید کر اس پر خود سرمایہ دار بن سکتا ہے۔ اسی طرح وہاں کوئی شخص اپنے مکان کے مالکانہ حقوق میں کسی دوسرے کو کسی قیمت پر شریک نہیں بنا سکتا۔ گویا اشتراکی فلسفۂ ملکیت کی رو سے حقِ شراکت شجرِ ممنوعہ ہے لیکن اسلام اگر اسے شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیتا تو آخر اس کے قانون پر آلاتِ جراحی کو استعمال کرنے سے حاصل ؟

(۹) حقِ انتقال ——— اس حق کے معنی یہ ہیں کہ مالک کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنی املاک میں سے جس کو چاہے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یا اپنے اعلیٰ اخلاقی و روحانی تقاضوں کی تسکین کے لئے دوسروں کی طرف منتقل کر دے۔

انتقال کی صورتیں متعدد ہیں۔ ان میں سے ایک بیع کی صورت ہے کہ کوئی شخص اپنی کوئی ملک دوسرے کی کسی ملک، یا نقد قیمت یا کسی خدمت کے عوض اسے دیدے، دوسری یہ ہے کہ وہ کسی پر صدقہ کر دے، تیسری یہ ہے کہ بطور عطا وہبہ نقد یا ٹھوس املاک یا اپنی خدمات (محنت) کسی دوسرے کو تفویض کر دے۔

اپنی املاک کو جائز اجتماعی ضروریات کے لئے وقف کرنے کا حق بھی حقِ انتقال کی ایک شاخ ہے۔ وقف کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ایک شئے کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے اسٹیٹ یا سوسائٹی واقف کے حسبِ منشا انتفاع کرتی رہے گی۔ واقف دراصل اپنی ملک کے کسی مخصوص استعمال یا انتفاع کے محدود حق کو اسٹیٹ اور سوسائٹی کے نام منتقل کر دیتا ہے۔

(۱۰) توارثِ اقربا ——— حقِ توارث اقربا بھی مالکانہ حقوق کی ایک دوسری شاخ ہے۔ اس حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی کے مرنے پر اس کی املاک اس کے اعزہ و اقربا میں "الاقرب فالاقرب" کے اصول پر بٹ جائیں گی۔ اسلام نے اس حق کو قائم کیا ہے اور افراد کو یہ ضمانت بہم پہنچائی ہے کہ اپنی کمائی ہوئی دولت میں سے جو کچھ وہ ترکے میں چھوڑ کر رخصت ہوں گے، وہ انھیں لوگوں کے کام آئیں گی جن کو وہ عزیز رکھتے تھے، جن سے ان کے قریبی تعلقات تھے اور جن کے ساتھ زندگی بھر اُس کا ربط و تعاون رہا ہے ——— کوئی غیر اس کے اقربا کی حق ماری نہ کرے گا۔

اس حق کو بھی اشتراکی فلسفۂ ملکیت نے بہت بڑی حد تک مجروح کر دیا ہے۔ نہایت ہی محدود نجی املاک (بالخصوص استعمالی اشیاء) کے بارے میں یہ حق تسلیم کیا گیا ہے۔

لیکن اسلام نے اس حق کو پوری طرح قائم کرتے ہوئے وراثت کا ایک مستقل قانون بنایا ہے جو نجی املاک ہی پر نہیں، تمام کاروباری املاک پر بھی، اور استعمالی اشیاء ہی پر نہیں بلکہ پیداآور سرمائے اور زمین اور کارخانوں پر نافذ ہوتا ہے۔ از روئے اسلام انسانی املاک میں سے کوئی چیز حقِ وراثت سے مستثنیٰ نہیں کی جا سکتی۔

یہ ہیں وہ حقوق مالکانہ جو اسلام نے انسان کی امانتی ملکیت کے بارے میں دوسرے انسانوں اور اسٹیٹ کے بالمقابل عطا کئے ہیں۔ آپ ان حقوق میں سے کسی ایک کو بھی یہ کہہ کر کالعدم نہیں قرار دے سکتے کہ صاحب! اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر انسانوں کے دعوائے ملکیت کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اس کا لحاظ کیا جائے۔ جی نہیں! خود اللہ ہی نے انسانوں کے لئے امانتی ملکیت کے یہ حقوق مقرر کئے ہیں۔ ان کو سلب کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا منصب نہیں۔ آپ اگر ان سے چھیڑ کرنے آئے ہیں تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کون ہوتے ہیں؟ آپ کو خدا کے اختیارات کس نے دیدیئے؟

آپ جواب دیتے ہیں کہ ہم آئے ہیں تو اپنے ساتھ اسٹیٹ کو لے کے آئے ہیں، یہ اسٹیٹ نائب خدا ہے اور اس وجہ سے یہ حق رکھتا ہے کہ افراد کے حقوقِ مالکانہ میں جو تصرف چاہے کرے۔ لیکن اس پر سوال پیدا ہوگا کہ اسٹیٹ جو نائب خدا ہے، اس کو آپ نے خدا کے خاص اختیارات کہاں سے لاکے دیدیئے؟ اگر وہ نائبِ خدا ہے تو خدا کی طرف سے سند (AUTHORITY) پیش کرے۔ پھر آپ کونسی سند اس کے غیر محدود اختیارات کے لئے پیش کریں گے؟

مذکورہ بالا حقوقِ مالکانہ کا تحفظ ایک مسلم ریاست اور مسلم سوسائٹی کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔ ان حقوق کے تحفظ کی اگر ضمانت نہ دی جائے تو پھر آزادی اور اطمینان کا انسانی زندگی میں خاتمہ ہو جائے گا۔ ان حقوق کو سلب کرتے ہی زندگی قفس بن جائے گی اور اسٹیٹ ایک جیلر کی حیثیت اختیار کرے گا۔

پس لازم یہ ہے کہ اسٹیٹ کو افراد کے حقوق مالکانہ میں دخل اندازی کرنے کے لئے جو محدود اختیارات خود اصل مالکِ املاک ــــــ خدا تعالیٰ ــــــ نے عطا کئے ہیں ان کو متعین طور پر سامنے رکھا جائے۔

انفرادی ملکیت میں اسٹیٹ کی مداخلت

دنیا میں افراد کا رجحان ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ اقتدار کی مداخلت سے اپنی زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ حد تک محفوظ رکھ سکیں۔ دوسری طرف اقتدار نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ افراد کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ حقوق و اختیارات حاصل کرلے۔ انفرادیت ضرورت سے زیادہ پاؤں پھیلا لیتی ہے تو اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ دوسری طرف اگر اقتدار حدود کو پھاند جاتا ہے تو افراد کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں۔ انفرادیت کا سر اگر پھر جائے تو اس کی آخری منزل انارکزم ہے اور اجتماعیت کا دماغ اگر اونچا اڑنے لگے تو اس کی حد پھر مستبدانہ آمریت ہوتی ہے۔

افراد اگر اپنی حد سے آگے بڑھیں تو اسٹیٹ ان کی مزاحمت کے لئے بیشمار ذرائع کو اختیار کر سکتی ہے لیکن اگر اسٹیٹ زیادتی پر اتر آئے تو اگرچہ رائے عام اس کا راستہ روکنے کے لئے انسانی لاشوں کے پہاڑ کھڑے کر دکھایا کرتی ہے، لیکن بہرحال اسٹیٹ کا مقابلہ کرنا بہت ہی ہولناک ہوتا ہے۔ تاہم اگر بدقسمتی سے اسٹیٹ ایک مرتبہ انفرادیت کے پورے حقوق کو اپنے قابو میں لے لے (جیسا کہ قومی ملکیت کے نظام میں ہوتا ہے) تو پھر ان حقوق کو واپس لینا ناممکن ہوتا ہے اور ایسی ریاست اگر رائے عام کے خلاف کوئی اقدام کرے یا پھر اس کے حکمران بگڑ جائیں تو ان کا راستہ روکنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔

پھر پیچیدگی یہ بھی ہوتی ہے کہ اسٹیٹ تو محض ایک شعور کا نام ہے جو ایک متعین قطعۂ ارضی میں کسی انسانی سوسائٹی کے ایک اقتدار کے تحت منظم ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسٹیٹ کوئی ذی روح شخص وجود نہیں ہے۔ اسٹیٹ کے کار پرداز بہرحال افراد انسانی ہی ہوتے ہیں، اور ان کا برسر اقتدار ہونا اور عام شہریوں کا ان کے تابع ہونا سوسائٹی میں حاکم طاقت اور عوام کے دو مستقل فریق پیدا کرتا ہے۔ ان فریقین کے درمیان حقوق و اختیارات کے لئے تاریخ میں ہمیشہ رسہ کشی جاری رہی ہے اور اس رسہ کشی میں زیادہ تر افراد ہی کو پسنا پڑا ہے۔

انھی حالات کی وجہ سے دورِ حاضر کی حکومتوں کے لئے "دستور" (CONSTITUTION) کی شدید اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ دستور کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت اور عوام کے حقوق و فرائض کا باقاعدہ تعین کر دیا جائے اور دونوں فریق بشدت مقررہ حدود کی پابندی کریں۔ یہ دستوریت سب سے پہلے دنیا میں اسلام کے ذریعہ نمودار ہوئی جس نے افراد اور اسٹیٹ کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کرنے کے لئے واضح خطوط کھینچ دیئے ہیں۔

ملکیت خود ایک دستوری مسئلہ ہے، اور یہ دستوری مسئلہ اس وجہ سے ہے کہ افرادِ انسانی اپنی زندگی کے امن وسکون کے تحفظ کے لئے اپنے املاک کے محفوظ رہنے کا اطمینان چاہتے ہیں! وحکمران طاقت (اسٹیٹ) کا رجحان ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ افراد کی ملکیتوں میں دخل اندازی کے نئے نئے راستے نکال سکے۔ اس کشمکش کو روکنے کے لئے ملکیت کے بارے میں ہر معقول نظام افراد کو آئینی ضمانت دیتا ہے لیکن اسلام سے زیادہ صفائی اور تعین کے ساتھ یہ ضمانت کسی دوسرے نظام نے نہیں دی۔ افراد کی ملکیتوں کو اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے پوری طرح محفوظ کرتے ہوئے، ریاست کو مداخلت کے جو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے گئے ہیں اُن کا اسلامی قانون میں قطعی طور پر تعین کر دیا گیا ہے۔ ان اختیارات سے اسلامی مملکت ایک انچ بھی آگے نہیں جا سکتی۔

اسٹیٹ کو انفرادی املاک میں مداخلت کرنے کے جو حقوق اسلام کی طرف سے دیئے گئے ہیں، ان کو یہاں ہم نمبر دار بیان کرتے ہیں۔

(۱) شرعی واجبات کی وصولی شرعی واجبات کی وصولی سے مراد ان محاصل کا افراد سے اخذ کرنا ہے جن کی ادائی افراد پر واجب ٹھیرائی گئی ہے۔ اُن میں سے بھی اسٹیٹ کی مداخلت کا تعلق ایسے محاصل سے ہے جن کے وصول و صرف کا نظم اجتماعی ہونا چاہیے، مثلاً زکوٰۃ و عشر وغیرہ۔

ان مالی واجبات کا نظم وصول و صرف اسلامی اسٹیٹ کے ذمے ہے، اور اس نظم کو مضبوط رکھنے کے لئے وہ پولیس کی قوت ہی کو نہیں، بلکہ اشد ضرورت کے موقعوں پر فوجی طاقت کو بھی استعمال کر تی ہے جیسے کہ سیدنا حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔

علیٰ ہذا القیاس شرعی واجبات میں وہ خراج بھی شمار ہوتا ہے جو خراجی زمینوں پر لگایا گیا ہو، وہ خمس بھی اسی ذیل میں آتا ہے جو معدنیات اور دفینوں میں سے ریاست کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

جنگ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت بھی تقسیم ہونے سے قبل اگر انفرادی قبضے میں آجائے تو بھی وہ انفرادی ملک میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ اسے جلد از جلد اربابِ امر کی تحویل میں چلے جانا چاہیئے لہٰذا اگر اسے روکا جائیگا تو اسٹیٹ بالجبر اسے وصول کرنے کی مجاز ہوگی۔

(۲) اسلامی عدلیہ کے عائد کردہ واجبات اسلامی ریاست کا نظام عدالت قانونِ الٰہی کے تحت مختلف

معاملات میں افراد پر جو مالی ذمے داریاں عائد کرتا ہے ان کو پورا کرنا بھی افراد پر شرعًا اور قانونًا واجب ہے۔ اس قسم کے واجبات کی وصولی کے لئے عدلیہ ڈگری بھی دے سکتا ہے اور قرقی بھی کرا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان معاملات میں انفرادی املاک میں ریاست جائز حدود تک تصرف کر سکتی ہے۔

اس قسم کے واجبات میں ثابت شدہ قرضے، تاوان، دیت کی رقوم، ہرجانے، نان و نفقہ، واجب الادا معاوضے اور محنتانے وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) مالیاتِ اجتماعی کے تقاضے ایک اسلامی ریاست کو اپنے زندہ رہنے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے عوام کے مختلف مسائل سے نمٹنے کے لئے جو بجٹ بنانا پڑتا ہے، اس کے مالی تقاضوں کو پورا کرنے کے ذمہ دار شہری ہیں۔ یہ تقاضے ضروری نہیں کہ ہر قسم کے حالات میں زکوٰۃ و عشر اور غنیمت و فے کی رقوم سے پورے ہو جائیں، بلکہ ان کے پورا کرنے کے لئے پبلک سے مختلف قسم کے چندے، ٹیکس اور قرضے حاصل کرنے پر ایک حکومت مجبور ہو سکتی ہے، قرضوں اور چندوں کا دار و مدار تو پبلک کی آزاد مرضی پر ہے، لیکن ٹیکس بہر حال ضابطے کے تحت وصول کئے جاتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ اسلامی ریاست کی مخصوص ٹیکسیشن پالیسی کے خطوط کیا ہیں، تاہم جو کچھ ٹیکس بھی وہ اپنی مالی ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لئے شہریوں پر عائد کرے گی، اُن کو ضابطے کی قوت سے وصول کرے گی۔ "ضابطے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ انفرادی املاک میں محدود مداخلت ہو۔

لیکن مالیاتِ اجتماعی کے تقاضوں کے تحت پبلک پر جو ذمے داریاں بھی عائد ہوں گی وہ ان کے اپنے منتخب دیانتدار اور قابلِ اعتماد نمائندوں کی مجلسِ شوریٰ (PARLIAMENT) کے "اجماع" سے ہوں گی۔ پالیمنٹ کا اجماع گویا عوام کی طرف سے امیر یا صدرِ حکومت کے سامنے ایک ٹیکس کے ادا کرنے کے لئے اظہارِ رضامندی کرے گا، تب امیر اس کی وصولی کے احکام و ضوابط کا اجرا عمل میں لائے گا اور اس کے لئے ایک مشنری تشکیل دے گا۔

(۴) ہنگامی ضروریات جیسے ایک فرد کی زندگی اتفاقی حادثات کی زد میں آجائے تو اسے بچانے کے لئے فوری طور پر تکلف، اخلاق اور قانون کے بہت سے حدود توڑنے کا موقع پیدا ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح اگر ایک اسٹیٹ، قوم اور سوسائٹی مجموعی طور پر ہلاکت کی زد میں آ جائے تو پھر

ہنگامی حالات (EMERGENCY) کے جو خاص تقاضے ہو سکتے ہیں ان کا لحاظ کئے بغیر چارہ نہیں۔

ایک مکان کو آگ لگی ہو اور اسے بجھانے کے لئے فوری طور پر پانی کی ضرورت پڑ جائے تو جہاں سے مل سکے حاصل کر لیا جاتا ہے اور پانی کے مالک سے دریافت تک کرنا ضروری نہیں ہوتا، فائر بریگیڈ کی خاطر ٹریفک کو روک لیتا ہے، مکان کی دیواریں گرانی پڑیں تو گرا دی جاتی ہیں، اسی طرح ریاست کی جان بچانے کے لئے یا حیاتِ عامہ کی بقا کے لئے کسی فوری حاجت کی روک تھام میں افراد کی املاک کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو وہ کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً قحط وارد ہونے پر غلے پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے، زیادہ شدید حالات میں اس کے تمام ذخائر کو حکومت بالجبر خرید سکتی ہے اور پبلک کے لئے راشن کو محدود کر سکتی ہے یا مثلاً جنگ کی صورت میں جب اسے فوری طور پر سڑکیں، ہوائی اڈے اور چھاؤنیاں بنانی پڑ جائیں تو اگر مالکانِ زمین مانع ہوں تو بھی وہ بنائے گی۔ اگر اس کے ناگزیر قسم کے جنگی پروگراموں میں افراد کی تعمیرات حائل ہوں تو وہ ان کو آخری چارۂ کار کے طور پر بالجبر منہدم کر سکے گی۔

اس قسم کے معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اولاً پوری کوشش انفرادی مالکوں کی رضا مندی کے ساتھ معاملہ طے کرنے کی ہونی چاہئیے، ورنہ اگر جبر کرنا بھی پڑے تو بھی از روئے انصاف ان کو پوری پوری قیمت ان کے املاک کی ادا کرنا ضروری ہے۔

ہنگامی حالات کے ختم ہو جانے کے بعد جونہی فضا اپنی سابق حالت کی طرف لوٹ جائے تو جو لوگ اپنی املاک کو واپس لینا چاہیں ان کو واپس کیا جانا چاہئیے۔

ہنگامی حالات کے خاص احکام کو عام حالات کے لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

ہنگامی حالات میں افراد کی املاک میں جو مداخلتیں مجبوری کرنی پڑیں ان کے لئے باقاعدہ اربابِ امر و شوریٰ کو اجماع سے متعین فیصلے کرنے چاہئیں، لیکن بعض صورتوں میں فوری کارروائیاں خود وزارتِ دفاع کو، بلکہ معمولی فوجی افسروں کو کرنی پڑتی ہیں۔

(۵) حقوقِ مالکانہ پر اسلام کے اخلاقی قیود کا نفاذ

اسلامی ریاست کی طرف سے انفرادی ملکیت کے حقوق میں مداخلت کرنے کا سب سے بڑا وسیع میدان اسی

عنوان کے تحت آتا ہے۔

اسلام نے حصولِ ملکیت کے لئے بعض ذرائع کو جائز اور بعض کو ناجائز بتایا ہے، پھر املاک کے استعمال کے بعض پہلوؤں کو حرام اور مکروہ اور بعض کو حلال اور مباح رکھا ہے، اسی طرح املاک کے تبادلے میں بعض صورتوں کو معروف میں شمار کیا ہے اور بعض کو منکر میں۔ گویا افراد کے جملہ مالکانہ حقوق کے گرد قانون و اخلاق کی مختلف حدود کے جنگلے لگے ہیں۔ ان جنگلوں کو جب کوئی فرد توڑنے لگتا ہے تو ریاست بالجبر اسے روک دیتی ہے۔

مثلاً ایک شخص چرا کر مال لے آیا یا سود کی کمائی تجوری میں لا ڈالی ہے یا پبلک کے اجتماعی املاک میں سے کوئی حصّہ اس نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے تو ریاست اس قسم کے اموال کو اس کے قبضے سے جبرًا نکال لے گی۔

اسی طرح ایک شخص مکان کی چھت کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ دوسروں کی پردہ داری میں خلل آتا ہے، وہ اپنے روپے کے عوض میں اپنے لئے ریشم کا لباس یا سونے کا زیور خرید کر استعمال کرتا ہے، یا وہ اپنی گاڑی کو بے ڈھنگے طریق سے ہانکتا ہے، یا وہ اپنی زمین پر کاشت کو رکھی محنت ناجائز شرائط کے تحت خریدتا ہے، یا وہ بت گری کے آرٹ کا ایک اسٹوڈیو کھول کے بیٹھتا ہے یا وہ اسلحہ کو عوام کے ڈرانے دھمکانے یا ان پر زیادتیاں کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے، تو اس طرح کی جملہ صورتوں میں اسٹیٹ حقوق مالکانہ کے غلط استعمال سے اُسے جبرًا روک دے گی۔

بعینہٖ اس طرح تبادلے کے معاملات میں قانون مداخلت کرے گا۔

اخلاقی قیود کا تعلق ملکیت کے تین پہلوؤں سے ہے۔

(ا) کیا وہ جائز طریق سے حاصل کی گئی ہے ؟

(ب) کیا وہ جائز طریق سے استعمال کی جا رہی ہے ؟

(ج) کیا اسے جائز طریق سے کسی دوسرے کے سپرد کیا جا رہا ہے ؟

ان تینوں میں سے جس پہلو میں بھی کوئی چیز خلافِ قانون ہوگی، حکومت بالقوۃ اس کی روک تھام کرے گی۔ لیکن اس قسم کی مداخلتوں کے لئے عدلیہ کے تحت باقاعدہ تحقیق اور قانونی فیصلہ ہونا ضروری ہے۔ بغیر اس کے اگر افراد کی املاک میں اسٹیٹ تصرف کرے تو وہ کھلا کھلا ظلم ہوگا۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی چیز کو اسلامی قانون

ناجائز قرار دیتا ہے؟ اگر نا جائز قرار دیتا ہے تو اس کی رو کے تھام کے لئے وہ کس قانونی تدبیر کا اختیار کرنا تجویز کرتا ہے؟

ان امور کا عدلیہ کے ذریعے تصفیہ کرائے بغیر اگر کسی ملک کے عوام اپنے جلسوں میں یا اس کے سیاسی ورکر اپنی تقریروں میں یا اس کے اخبار نویس اپنے افتتاحیوں میں ایک طوفان اٹھا دیں کہ فلاں شخص یا گروہ یا طبقے کے املاک سلب کر لئے جائیں تو اس طوفان کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ طریقہ مفسدین کا ہے، نہ کہ اسلام پسند لوگوں کا!

سلبِ ملکیت ویسی ہی چیز ہے جیسے قتل، قتلِ جسمانی کی طرح قتلِ معاشی بھی ایک انتہائی چیز ہے۔ پس جیسے قتلِ جسمانی "بغیرِ حق" جائز نہیں، اسی طرح قتلِ معاشی بھی بغیرِ حق جائز نہیں۔ وہ بھی قانونِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے، اور یہ بھی قانونِ الٰہی کے تحت ہونا چاہئے جس طرح کسی شخص کا ہر گناہ اسے واجب القتل نہیں بناتا، اسی طرح کسی شخص کی ہر معاشی گمراہی اسے معاشی قتل کا مستوجب نہیں قرار دے دیتی۔ قتلِ جسمانی کے فیصلے کرنا پریس، رائے عام اور سیاسی پارٹیوں کا کام نہیں ہے تو قتلِ معاشی کے فیصلے کرنے کا اختیار بھی ان عناصر کو نہیں دیا گیا۔ کسی صاحبِ املاک کے خلاف جو دعویٰ بھی پریس، عوام یا سیاسی پارٹیوں کو ہو، اسے وہ اسلامی قضاء کے نظام کے رو برو رکھ دیں، اور پھر جو فیصلہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے تحت صادر ہو اس کو عمل میں لایا جائے۔

فرد کا حقِ حفاظتِ ملکیت

فرض کیجئے کہ ریاست کا کوئی کارکن یا عہدے دار ان حدود سے تجاوز کر کے افراد کے املاک پر دستِ تعدّی دراز کرتا ہے یا اسٹیٹ کا ایڈمنسٹریشن افراد کے حقوقِ مالکانہ کو مجروح کرتا ہے تو ایک فرد زیادتیوں کے مقابلے میں اپنے املاک کی حفاظت کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے کا اسی طرح حقدار ہے جس طرح وہ ایمان، جان اور آبرو کی حفاظت کا حق رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ تین قسم کے ذرائع اختیار کر سکتا ہے:

(۱) اپنی پوری امکانی قوت کو زیادتی کے خلاف استعمال کرے، حتیٰ کہ اگر کشمکش میں جان دینی پڑے تو دے دے۔ وہ اگر برسرِ حق ہے تو عنداللہ اس کی موت شہادت کی موت ہو گی اور اس کی نصرت ہر مسلم پر فرض ہے[1]۔

[1] ہارون الرشید کے محل کی توسیع کے لئے ایک بڑھیا کی زمین حاصل کرنا ضروری تھا لیکن وہ بڑھیا مانع ہوئی اور حکمران کو اس دورِ استغلاط میں بھی، اس کا حق تسلیم کرنا پڑا۔

(۲) وہ زیادتی کے خلاف حکام کے سامنے اور پبلک میں تمام جائز ذرائع سے صدائے احتجاج بلند کرے اور رائے عام کا دباؤ ڈالے۔

(۳) وہ عدالت کے ذریعے ناجائز احکام و مطالبات کے خلاف حکمِ امتناعی حاصل کرے یا اپنے اموالِ مغصوبہ کی واگذاشت کے لئے ڈگری حاصل کرے۔[۵۱]

یہ مضمون یوں تو یہاں پہنچ کر مکمل ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ ملکیت کے مسئلے میں بعض اہم غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لئے مزید بحث کی ضرورت ہے، اس لئے اشاعتِ آئندہ میں ذیل کے موضوعات پر گفتگو کی جا رہی ہے:۔

(۱) محض محنت ذریعۂ ملکیت نہیں۔[۵۲]

(اسلام میں حصولِ ملکیت کے جائز راستوں کی تفصیل)

(۲) اسلام میں مساواتِ ملکیت کوئی اصول نہیں۔[۵۳]

(۳) اسلام میں املاک کے لئے کوئی مقداری تحدید نہیں۔

(۴) کیا اسلام کاروباری سرمایے کی ملکیت پر کوئی پابندی لگاتا ہے؟

(۵) کیا قومی ملکیت کا اصول نظامِ اسلامی میں اختیار کیا جا سکتا ہے؟

(۶) خلافتِ راشدہ میں کارکنانِ حکومت کے املاک میں مداخلت کی توجیہ۔

(۷) سرمایہ داری اور اسلام کے نظامِ ملکیت میں فرق۔

---

۵۱ جیسے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے اموالِ مغصوبہ کی واپسی کے لئے استغاثے پیش ہوئے اور تحقیق کے بعد ان پر فیصلے دیئے گئے۔

۵۲، ۵۳ ان مسائل میں، قرآن کی بعض آیات میں جو تحریف و تاویل کی جاتی ہے، اس کی حقیقت پوری طرح واضح کر دی گئی ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ کے سلسلے میں چند ضروری باتیں

اس مختصر مضمون میں ایک نہایت ہی اہم مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔
ہم نے مناسب سمجھا کہ اسے شائع کر دیا جائے، کیونکہ یہ سوال آئے
دن سامنے آتا رہتا ہے۔ انشاء اللہ اشاعتِ آئندہ میں مولانا سید
ابوالاعلیٰ مودودی اس موضوع پر اپنی تحقیق پیش فرمائیں گے۔ (ن۔ص)

زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف "فی سبیل اللہ" ہے جس کے بارے میں عام مفسرین اور فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اعانت مجاہدین اور وہ سامان جہاد ہے جو ان کی ملک میں دیدیا جائے بعضوں کے نزدیک سفر حج بھی اس کے تحت داخل ہے جیسا کہ ام معقل والی حدیث میں آگیا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا فی سبیل اللہ کے مصرف کو اس سے زیادہ وسعت دی جا سکتی ہے۔ یعنی تبلیغ واشاعتِ اسلام اور اقامتِ دین کے دوسرے کاموں میں بغیر تملیک کے بھی زکوٰۃ کا مال فی سبیل اللہ کے تحت صرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ میرے علم میں قدماء میں سے کسی کی رائے توسیع کی موافقت میں نہیں ہے البتہ کتاب الاموال میں انس بن مالک کا ایک اثر مل گیا ہے جس سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے وہ اثر یہ ہے۔ عن انس بن مالک والحسن قال اعطیت فی الجسور والطرق فھی صدقۃ ماضیۃ۔

اسمٰعیل بن ابراہیم جو ابن علیہ کے نام سے معروف ہیں اس اثر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں انھا تجزی من الزکوٰۃ (کتاب الاموال ص ۵۷۴)

امام ابو یوسفؒ کے متعلق عام فقہاء یہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہی لیا ہے لیکن کتاب الخراج دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تحدید کے قائل نہیں تھے مصارف کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فاما[1] المولفۃ قلوبھم قد ذھبوا۔ والعاملون[2] علیھا یعطیھم الامام مایکفیھم وان قل من الثمن

اوا کثر۔ اعطی الوالی منہا مایسعہ ویسع عمالہ من غیر صرف ولا تقتیر وقسمت بقیۃ الصدقات بینہم فللفقراء ۳ وللمساکین سہم ۔ وللغارمین وھم الذین لایقدرون علیٰ قضاء دیونہم سہم ۔ وفی ابناء السبیل المنقطع لھم سہم یحملون بہ ویعادون وفی الرقاب سہم وسہم فی اصلاح طرق المسلمین الخ۔

خط کشیدہ الفاظ خاص طور سے قابلِ غور ہیں اور آٹھویں مصرف سے مراد فی سبیل اللہ ہی ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے یا بعد اس مصرف کی تشریح نہیں کی ہے۔ اور نہ تشریح میں قرآن کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔

بخاری باب القسامۃ اور ابوداؤد "باب القتل بالقسامۃ" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سہل کے قتل کے سلسلے میں زکوٰۃ کے سو اونٹ دیت کے طور پر دیئے (فودا ہ مائۃ من ابل الصدقۃ) بعض روایتوں میں "من عندہ" کا لفظ ہے بہرحال ترجیح جس لفظ کو بھی ہو لیکن "من ابل الصدقۃ" کے لفظ کو محدثین نے رد نہیں کیا ہے بلکہ اس کو تسلیم کر کے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے پوری تفصیل فتح الباری میں موجود ہے (ج ۱۲ ص ۲۰۶)

اسی روایت کے تحت قاضی عیاض رحمۃ اللہ نے بعض علماء کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال کو مصالح عامہ کے کاموں میں صرف کرنا جائز سمجھتے ہیں اور وہ خود بھی اسی کے قائل تھے (فتح الباری)

البدائع والصنائع میں ہے کہ اما قولہ فی سبیل اللہ عبارۃ عن جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعۃ اللہ وسبیل الخیرات (ج ۲)

حال کے مفسرین میں نواب صدیق حسن خان صاحب نے "قیل" کے لفظ سے مصالح عامہ کے جواز کا قول نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ رشید رضا مصریؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے اپنی تفسیروں میں وسعت دی ہے حضرت الاستاذ جناب سید صاحب نے بھی سیرت کی پانچویں جلد میں وسعت ہی کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات قابلِ غور یہ ہے کہ عام فقہاء کرام للفقراء اور اس کے معطوفات علیہ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس پر "لام" تملیک کا ہے اور قرآن میں فی سبیل اللہ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد جہاد ہی ہے اس کے متعلق حضرت سید صاحب نے سیرت میں جو کچھ لکھا ہے ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد ہی لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی ابھی آیت گزر چکی ہے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ یہاں فی سبیل اللہ سے

بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دین کا کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر اُن کا استدلال جو "للفقراء" کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "لام" انتفاع ہو جیسے خلق لکم ما فی الارض جمیعًا (سیرت ج ۵ ص ۲۳۷)

ابن عربی مالکی نے اپنی کتاب الاحکام میں لکھا ہے کہ واختلف العلماء فی معنی الذی افادت هذه اللام لام الاجل کقولك هذه السرج للدابة والباب للدار وبه قال مالك وابو حنیفه ومنهم من قال ان هذه لام التملیك کقولك هذا المال لزید وبه قال الشافعی (ج ا ص ۱۹۷)

اس وقت اقامتِ دین کے کاموں اور مدارس کے قیام و بقا کی اہمیت ملحوظ خاطر رہے نیز یہ کہ اس وقت ان مدات کے خرچ کرنے میں عربی مدارس میں جو فقہی حیلے کئے جاتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تملیک کا مسئلہ نص کی حیثیت نہیں رکھتا تو فقہی حیلوں کے بجائے اس کو اصولی طور پر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے اور بہرحال حیلے کی حیثیت یا حسب مرضیہ نہیں ہے بلکہ دین کی روح کے لحاظ سے تو غیر مرضیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

رسائل و مسائل

"خدا اندر قیاسِ ما نہ گنجد"

سوال :-

کچھ عرصہ ہوا ایک دوست کے ساتھ میری بحث ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ خدا ہے یا نہیں؟ اور ہے تو وہ کہاں سے آیا۔ ہم دونوں اس معاملے میں علم نہیں رکھتے تھے، لیکن پھر بھی میں سوال کے پہلے جز کی حد تک اپنے مخاطب کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن دوسرے جز کا کوئی جواب مجھ سے بن نہیں آیا۔ چنانچہ اب یہ سوال خود مجھے پریشان کر رہا ہے۔

ایک موقع پر میری نظر سے یہ بات گزری ہے کہ نبی صلعم سے بھی یہ سوال کیا گیا تھا اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ کچھ باتیں انسان کے سوچنے اور سمجھنے سے باہر ہوتی ہیں، اور یہ سوال بھی انھیں میں شامل ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ آنحضور کے اس فرمودہ سے اطمینان حاصل کروں، لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ براہِ کرم آپ میری مدد فرمائیں۔

میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بننے کے لئے کن کن اصولوں پر چلنا چاہیے؟

جواب :-

آپ کے ذہن کو جس سوال نے پریشان کر رکھا ہے، اس کا حل تو کسی طرح ممکن نہیں، البتہ آپ کی پریشانی کا حل ضرور ممکن ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ آپ اس قسم کے مسائل پر سوچنے کی تکلیف اٹھانے سے پہلے اپنے علم کے حدود (LIMITATIONS) کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جب آپ یہ جان لیں گے کہ انسان کیا کچھ جان سکتا ہے اور کیا کچھ نہیں جان سکتا تو پھر آپ خواہ مخواہ ایسے امور کو جاننے کی کوشش میں نہ پڑیں گے جن کو جاننا آپ کے بس میں نہیں ہے۔ خدا کی ہستی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جو کچھ آدمی کے امکان میں ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ آثارِ

کائنات پر غور کر کے ایک نتیجہ اخذ کر سکے کہ خدا ہے، اور اس کے کام شہادت دیتے ہیں کہ اس کے اندر یہ اور یہ صفات ہونی چاہئیں یہ نتیجہ بھی "علم" کی نوعیت نہیں رکھتا، بلکہ صرف ایک عقلی قیاس اور گمانِ غالب کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس قیاس اور گمان کو جو چیز پختہ کرتی ہے وہ یقین اور ایمان ہے لیکن کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے جو اس کو علم کی حد تک پہنچا سکے۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جب خدا کی ہستی کے بارے میں بھی ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم کو اس کے ہونے کا "علم" حاصل ہے، تو آخر اس کی حقیقت کا تفصیلی علم کیونکر ممکن ہے۔ خدا کی ذات تو خیر بہت بلند و برتر ہے، ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ "زندگی" کی حقیقت اور اس کی اصل (ORIGIN) کیا ہے۔ یہ توانائی (ENERGY) جس کے متعلق ہمارے سائنسداں کہتے ہیں کہ اسی نے مادے کی شکل اختیار کی ہے اور اس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے، اس کی حقیقت ہمیں نہیں معلوم؛ اور نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ کہاں سے آئی اور کس طرح اس نے مادے کی گوناگوں شکلیں اختیار کیں۔ اس قسم کے معاملات میں "کیوں" اور "کیسے" کے سوالات پر غور کرنا اپنے ذہن کو اس کام کی تکلیف دینا ہے جس کے انجام دینے کی طاقت اور ذرائع اس کو حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس لئے یہ غور و فکر نہ پہلے کبھی انسان کو کسی نتیجے پر پہنچا سکا ہے، نہ اب آپ کو پہنچا سکتا ہے۔ اس کا حاصل بجز حیرانی کے اور کچھ نہیں۔ اس کے بجائے اپنے ذہن کو ان سوالات پر مرکوز کیجئے جن کا آپ کی زندگی سے تعلق ہے اور جن کا حل ممکن بھی ہے۔ یہ سوال تو بے شک ہماری زندگی سے تعلق رکھتا ہے کہ خدا ہے یا نہیں، اور ہے تو اس کی صفات کیا ہیں، اور اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی رائے اختیار کرنا ضروری ہے، کیونکہ بغیر اس کے ہم خود اپنی زندگی کی راہ متعین نہیں کر سکتے، اور اس معاملے میں ایک رائے قائم کرنے کے لئے کافی ذرائع بھی ہمیں حاصل نہیں ہیں، لیکن یہ سوال کہ "خدا کہاں سے آیا" نہ ہماری زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق رکھتا ہے اور نہ اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کے ذرائع ہم کو حاصل ہیں۔

آپ کا دوسرا سوال کہ "انسان کو انسان بننے کے لئے کن اصولوں پر چلنا چاہئے" ایسا نہیں ہے کہ اس کا جواب ایک خط میں دیا جا سکے۔ میں اپنی کتابوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر مفصل لکھ چکا ہوں۔ آپ ان کو ملاحظہ فرمائیں۔ مثلاً اس کے لئے میرے مضامین "سلامتی کا راستہ"، "اسلام اور جاہلیت"، "اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر" اور "دینِ حق" کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (ا۔م)

قومی ملکیت

سوال :۔

چونکہ جماعت اسلامی اور آپ ذاتی طور پر قومی ملکیت کے بارے میں ایک خاص طرزِ فکر رکھتے ہیں، اس لئے بعض شکوک پیش کر رہا ہوں۔ توقع ہے کہ آپ ان کا ازالہ فرمائیں گے۔

موجودہ دور میں ذہن اشتراکیت سے ضرور متاثر ہیں اور محرومین (HAVE-NOTS) اور منعمین (HAVES) کے درمیان طبقاتی کشمکش کا موجود ہونا قومی ملکیت کے نظریئے کو ابھار رہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ اور جماعتِ اسلامی اراضیات اور صنعت وغیرہ کو قومیانے (NATIONLIZATION) کے متعلق اس حتمی نتیجے پر کس طرح پہنچے ہیں کہ اسلام اس کے خلاف ہے۔ آپ بہ حیثیت داعی یا محقق کے اپنی رائے کا اظہار تو کر سکتے ہیں مگر آخری اور قطعی فیصلہ کا حق نہیں رکھتے یہ کام تو اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ کا ہوگا کہ وہ کتاب و سنت پر بحث کر کے کسی آخری نتیجے پر پہنچے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قومی ملکیت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ غالباً آپ کی رائے یہ ہے کہ اسلامی حکومت انفرادی حقوقِ ملکیت میں مداخلت کی مجاز نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اسلامی لٹریچر اس متنازعہ مسئلے کو سرے سے چھوتا ہی نہیں۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اسلام انفرادی حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے مگر اس سے یہ اخذ کر لینا کہ اراضیات و دیگر املاک (صنعتی و کاروباری) کو قومی نہیں قرار دیا جا سکتا، سراسر ناانصافی ہے۔ کسی حق کو تسلیم کرنا اور شے ہے اور کسی حق کے حصول کو لازمی قرار دینا اور چیز ہے۔ رسول اللہ صلعم کا جاگیریں اور پنشنیں دینا یہ ثابت نہیں کرتا کہ اسلامی حکومت پبلک کی ساری زمین کو اپنے چارج میں نہیں لے سکتی کسی امر کا بطور واقعہ (DEFACTO) ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ قانونی طور پر (DE-JURE) بھی وہ واجب ہے۔ غالباً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم ایسا ثابت نہیں کہ ہر شخص کو زمین یا کارخانے کا مالک ہونا چاہیئے۔ پھر جو چیز لازم نہیں، اس کا ترک کرنا ناجائز کیسے ہوا؟ خود قرآن میں ہے کہ "جو کچھ زمین میں ہے وہ تم سب کا ہے۔" اور حکومتِ اسلامی انتخابی ہونے کے لحاظ سے بحکمِ خداوندی ہم سب کی ہے۔ اگر ایسی حکومت املاک کو ہم سب کے لئے اپنے تصرف میں کر لے تو امتناع یا

تناقض کی بنا پر کہاں تک ہے ؟ انفرادی ملکیت کا معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں ایک خاص دور کے حالات کے تحت غلام رکھنے کی اجازت دی گئی تھی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرور غلام رکھے جائیں۔

میرا مدعا یہ ہے کہ تسلیم حق، نفاذِ حق کے مترادف نہیں جو حق فرضیت تک نہیں پہنچتا اور اختیاری ہے، اسے جمیع مسلمان اگر چاہیں تو چھوڑ سکتے ہیں۔ میرے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ گزشتہ ادوار میں کونسا طریقہ نظامِ اراضی میں رائج تھا، بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ از روئے قرآن و سنت حکومتِ اسلامی کثرتِ رائے سے جمیع مسلمانان کی جمیع اراضیات اپنے تصرف میں لاکر بہتر طریق پر پیداوار حاصل کرکے لوگوں میں بانٹ سکتی ہے۔ باقی رہا انفرادی ملکیت کا حق تو وہ نہ کبھی پہلے دنیا یکسر ختم کرسکی، نہ آئندہ کرسکے گی۔

اگر افراد کو پورا پورا حقِ ملکیت دیدیا جائے تو پھر حکومت اپاہج ہو جائے، پھر وہ نہ غلہ کا کنٹرول کرسکتی ہے، نہ لائسنس سسٹم رائج کرسکتی ہے، نہ تجارت پر نگرانی قائم کرسکتی ہے۔

قومی ملکیت کے لئے اکثریت کی مرضی معلوم کرنے کا ذریعہ اگر مجلسِ شوریٰ کافی نہ ہو تو استصوابِ عام (REFERENDUM) بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر پوری قوم کی مرضی یہ فیصلہ دیدے تو اسے خلافِ اسلام کیسے کہا جاسکتا ہے ؟

جواب :-

جو سوالات آپ نے چھیڑے ہیں ان کا مفصل جواب تو ایک خط میں دینا مشکل ہے، لیکن امید ہے کہ یہ چند اشارات آپ کے لئے کافی ہوں گے۔

آپ کا یہ خیال درست ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ آئندہ اسلامی حکومت یا پارلیمنٹ کو کرنا ہے اُن کے بارے میں ہم اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی حیثیت سے کوئی پیشگی فیصلہ کر دینے کا آئینی حق نہیں رکھتے، اور اگر ہم ایسا کوئی فیصلہ کر بھی دیں تو اس کا کوئی آئینی وزن نہیں ہے۔ مگر کیا ہم ایک جماعت کی حیثیت سے یہ کہنے کا حق بھی نہیں رکھتے کہ فلاں تدبیر یا فلاں طریق کار ہمارے نزدیک غیر اسلامی ہے ؟ اور کیا ہم یہ فیصلہ کرنے کے بھی مجاز نہیں ہیں کہ فلاں تجویز جب کبھی زیرِ بحث آئے گی تو ہم اس کی مخالفت کریں گے ؟ اگر آپ مانتے ہیں کہ ہر شخص یا گروہ جس نے دینی مسائل میں رائے دینے کی استعداد بہم پہنچائی ہے، اس طرح کے

فیصلے کرنے کا حق رکھتا ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کوئی بات اس سے زیادہ نہیں کی ہے ہم خود بھی جانتے ہیں کہ ایسے معاملات میں ہمارے فیصلے آئندہ اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ کو پابند کرنیوالے نہیں ہیں۔

اب آپ اصل مسئلے کو لیجئے۔ قومی ملکیت کے بارے میں اصولی طور پر دو سوال تصفیہ طلب ہیں :-

ایک یہ کہ آیا تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینا اسلام کے فلسفۂ اجتماع (SOCIAL PHILOSOPHY) کی رو سے بھی اسی طرح مطلوب ہے جس طرح اشتراکیت کے فلسفۂ اجتماع کی رو سے ہے؟ یا اگر مطلوب نہیں تو کیا کم از کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنا اسلامی فلسفۂ اجتماع کی مجموعی اسپرٹ سے مطابقت رکھتا ہے؟

دوسرے یہ کہ قومی ملکیت کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر کیا یہ درست ہے کہ کوئی پارلیمنٹ ایک حکم کے ذریعے سے اراضی اور دوسرے ذرائع پیداوار پر سے افراد کی ملکیت کو ساقط کر کے ان پر اجتماعی ملکیت قائم کر دے؟ یا یہ فیصلہ کر دے کہ تمام افراد اپنی ایسی ملکیتیں حکومت کی مقررہ قیمتوں پر حکومت کے ہاتھ لازماً بیچ دیں؟

امرِ اول کے بارے میں آپ میری کتاب "ملکیتِ زمین" کا آخری باب ملاحظہ فرمائیں۔ نیز میں نے اپنی کتاب "سود" پر نئے مباحث کا جو اضافہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لیں۔ نعیم صاحب کا پمفلٹ "قومی ملکیت" بھی نگاہ میں رہے تو بہتر ہے۔ ان چیزوں کو ملاحظہ فرمانے کے بعد بھی اگر آپ کی رائے یہ ہو کہ ذرائع پیداوار کو بطور ایک مستقل پالیسی کے قومی ملکیت بنا دینا اسلامی فلسفۂ اجتماع کی رو سے مطلوب ہے یا اس سے مطابقت رکھتا ہے تو براہِ کرم آپ اپنے دلائل ارشاد فرمائیں اور ساتھ ہی ہمارے دلائل پر تنقید کر کے ان کی غلطی بھی واضح کر دیں۔

امرِ دوم کے بارے میں ایک قانون دان کی حیثیت سے کیا آپ اس کا ثبوت دے سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت تمام افراد کی نہیں بلکہ کسی ایک شخص ہی کی ذاتی ملکیت کو اس طرح ساقط کر دینے یا اس کو اپنے املاک کی فروخت پر مجبور کرنے کی اجازت دیتی ہے؟ خصوصاً جب کہ اسقاط یا اجبار ایک ایسے فلسفۂ اجتماع پر مبنی ہو جو بہرحال قرآن و حدیث سے ماخوذ نہیں ہے؟ (ا-م)

ایک زمینداری میں رضاکارانہ طور پر اصلاحات کا آغاز

سوال:-

میں ایک بڑی زمینداری کا مالک ہوں۔ میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ اپنے مزارعین سے شریعت محمدیؐ کے مطابق معاملہ کروں۔ اس مقصد کے لئے میں اپنے موجودہ طرزِ عمل کی تفصیلات تحریر کر رہا ہوں، اُن کے بارے میں واضح فرمایئے کہ کیا کیا چیزیں غلط ہیں اور کیا کیا صحیح ہیں۔

(۱) میں نے ہر مزارع کو دس بارہ ایکڑ زمین فی ہل دے رکھی ہے۔ بیگار مدت سے رائج تھی، لیکن میں نے بند کر دی ہے۔ صرف وسائل آبپاشی وغیرہ کی درستی مزارعین کے ذمے ہے۔

(۲) میں ہر پیداوار میں سے ۱/۲ حصہ لیتا ہوں۔ پانی کا محصول سرکاری (آبیانہ) کل مزارعان دیتے ہیں۔ اور ملکیت کا محصول (ٹھیکہ یا مطالبہ مالی) میں ادا کرتا ہوں۔ باقی محصول (زرعی ٹیکس کے سوا) بٹائی کے تناسب سے مشترکہ طور پر ادا کئے جاتے ہیں، علیحدہ مزارعین کو نہیں دیا جاتا۔

(۳) تخم بحصّہ اجناس بذمہ مزارعان ہوتا ہے، اور بعض اجناس کے تخم کا ۱/۲ حصہ میں دیتا ہوں۔

(۴) ۲ سیر فی من (۱/۲ حصۂ پیداوار کے علاوہ) کل پیداوار میں سے جداگانہ طور پر وصول کیا جاتا ہے اور کسی طرح کا لگان یا بیگار، پہرہ وغیرہ کی خدمات نہیں لی جاتیں۔

(۵) میرے ملازمین کاشت بھی ہیں جن میں سے چند حصہ پر ہیں اور چند تنخواہ دار ہیں۔ حصہ داری پر کام کرنے والے میرے بیلوں کے ساتھ میری اراضی میں میرے منیجروں کی ہدایات کے تحت کام کرتے ہیں۔ بیج میرا ہوتا ہے۔ بعد میں حقِ ملکیت کے طور پر ۱/۲ حصہ بٹائی اور ۲ سیر فی من کل انبار میں سے وصول کرتا ہوں۔ بقیہ غلّہ کا نصف بیلوں کے مصارف میں لیا جاتا ہے اور نصف کارکنوں کی کارکردگی کے حق میں دیا جاتا ہے۔

مثلاً ا، ب، ج میرے حصہ دار ہیں اور د، ذ میرے ملازم ہیں۔ ان کے پاس میرے ۵ جوڑی بیل کاشت کے لئے ہیں۔ میں ۵۰ من غلّے میں سے اپنی بٹائی لے کر حصے ا، ب، ج کو

دوں گا، باقی ۵ حصے بیلوں کے اور ۵ حصے تنخواہ دار ملازموں کے ہوں گے، کیونکہ ان کی تنخواہ میرے ذمے ہے۔ آبیانہ وغیرہ علاوہ ملکیتی لگان سرکاری کے مندرجہ بالا نسبت سے ادا ہوگا۔

(۶) میری ملکیت وراثۃً میرے پاس منتقل ہوئی ہے اور میرے آباؤ اجداد نے حکومت سے یا دوسرے زمینداروں سے "قیمتاً" لی تھی، میرے پاس کوئی سرکاری جاگیر وغیرہ نہیں۔

براہ کرم میرے معاملے پر توجہ فرمائیں۔ شاید اللہ تعالیٰ دوسرے اہل زمین کو بھی دیکھا دیکھی توفیق اصلاح دے۔

جواب:-

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے خود اپنی زمینداری کو رضا کارانہ طور پر شریعت کے مطابق درست کرنے کا ارادہ فرمایا۔ کاش کہ دوسرے زمیندار بھی اسی طرح اپنے معاملات کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں۔

آپ نے اپنے معاملات کی جو شکلیں بیان فرمائی ہیں اُن میں سے نمبر ۱، ۲، ۳ تو جائز ہیں مگر نمبر ۴ کا پہلا حصہ غلط ہے، اسے بدل دیجئے۔ پیداوار میں سے ½ حصہ کے علاوہ ۳ سیر فی من کل انبار میں سے وصول کرنا آپ کی پوری بٹائی کو ناجائز کر دیتا ہے۔ آپ صرف نسبت کے اعتبار سے اپنا حصہ لینے کے حقدار ہیں۔ وزن کے اعتبار سے ایک متعین مقدار وصول کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔

نمبر ۵ میں جو صورتِ معاملہ آپ نے بیان کی ہے اُس میں اجرت اور بٹائی کو خلط ملط کر دیا گیا ہے جس سے ظلم کی راہ نکل سکتی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنی اراضی کے جن قطعات کو اجرت دے کر کاشت کرانا ہو انہیں الگ رکھیں اور جن کو بٹائی پر دینا ہو انہیں خالص بٹائی کے لئے مخصوص کر دیں۔ اجرت پر کام لینے کی صورت میں زمین کی ساری پیداوار خواہ کم ہو یا زیادہ آپ کی ہوگی، اور آپ کے ملازم صرف اپنی اجرت کے مستحق ہوں گے۔ اور بٹائی پر زمین دینے کی صورت میں آپ کو یا آپ کے منیجروں کو مزارعین کے کام میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ خواہ محض زمین مزارعوں کو دیں یا بیل اور بیج میں سے بھی کوئی چیز دیں، بہرحال آپ ایک طے شدہ نسبت کے مطابق پیداوار میں سے صرف اپنا حصہ لینے کے مجاز ہیں۔

نمبر ۶ میں آپ نے اپنی زمینداری کی جو اصل بیان کی ہے، وہ اگر درست ہے تو آپ کی ملکیت شرعاً

درست قرار پائے گی۔ اس صورت میں طریقۂ زمینداری کی اصلاح آپ کے ذمّے ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرض ہے کہ اس وقت جو شرعی وارث موجود ہوں ان کے حصّے آپ انھیں تقسیم کر دیں۔

سوال [1] :-

دوبارہ مشکور ہوں کہ چند باتیں جناب کے نوازش نامے سے نہیں سمجھ سکا، ان کی مزید توضیح کی درخواست کروں۔

(۱) اگر موجودہ بیرونی بٹائی کے علاوہ لینا درست نہیں ہے تو پھر دوسرا راستہ یہ ہے کہ بٹائی کی شرح تبدیل کروں۔ مثلاً ½ کے بجائے ⅓ یا ⅖ کی شرح قائم کی جا سکتی ہے۔ یا کوئی اور صورت جو شرعاً زیادہ مناسب ہو تحریر فرمائیں۔

حصہ داروں اور ملازمین کے رقبوں کو علیحدہ کرنے کے لئے میں نے آج ہی کہہ دیا ہے۔

بہرحال بٹائی کے شرعی طریق یا تناسب سے مطلع فرمائیں۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ میرے ملازمین یا منیجروں کو مزارعین کے کام میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان کی نگرانی نہ کی جائے تو وہ مالک زمین کا حق مار کھائیں گے اور کماحقہٗ محنت نہ کریں گے۔ ملازمین کے مصارف کا بوجھ صرف مجھی پر ہوتا ہے، مزارعین کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ میں اپنی ملکیت کو اس وقت شرعی وارثوں میں (جو موجود ہوں) تقسیم کر دوں۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ میرے باپ پر جو حصہ ان دنوں شریعت واجب الادا تھے تو یہ ان کے ذمے تھے۔ میرے نام مرحوم والد نے اپنی زندگی میں ہر قسم کی ملکیت برضائے خود منتقل کر دی تھی اور یہ واقعہ ان کی وفات سے چند سال قبل کا ہے۔ اندریں حالات مجھ پر صرف میرے اپنے ہونے والے ورثا کا حق واجب ہوگا یا والد مرحوم کے پس ماندگان کا بھی؟ ——— اگر والد مرحوم کے پس ماندگان کو بھی ان کا حق ادا کرنا ہی چاہیے تو میرے دوسرے بھائی اس معاملے میں ساتھ نہ دیں گے اور میں اکیلا ان کے حقوق پورے کبھی نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا

---

[1] پہلے خط کا جواب پانے کے بعد مستفسر نے دوبارہ خط لکھا اور چند امور میں مزید توضیح چاہی۔

ہوں کہ یہ معاملہ والد مرحوم کی ذمہ داری سے متعلق تھا نہ کہ مجھ سے۔

جواب :-

(۱) بٹائی کا یہ طریقہ اصولاً صحیح ہے کہ پیداوار جو کچھ بھی ہو اس میں سے مالک زمین اور کاشتکار، متناسب طریق پر حصہ تقسیم کریں، مثلاً یہی کہ $\frac{2}{3}$ مالک کا اور $\frac{1}{3}$ کاشتکار کا۔ مگر اس معاملے میں انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لئے یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہر کاشتکار کو کم از کم آپ اتنی زمین کاشت کے لئے دیں جس کی پیداوار کا حصہ اس کی انسانی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ نیز تناسب مقرر کرنے میں رواج سے قطع نظر کر کے انصاف کے ساتھ یہ دیکھیں کہ حاصل شدہ پیداوار کی تیاری میں آپ کا اور آپ کے کاشتکار کا واقعی کتنا حصہ ہے۔ اس معاملے میں کوئی عالمگیر ضابطہ تو بنایا نہیں جا سکتا، اس لئے کہ ہر علاقے کے زراعتی حالات مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ بادی النظر میں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ کی صرف زمین ہو، اور بیج، ہل اور محنت سب کاشتکار کی ہو تو اس صورت میں $\frac{2}{3}$ اور $\frac{1}{3}$ کی نسبت مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ بہرحال یہ ضروری ہے کہ مالکان زمین اپنے معاملات کو صرف شرعی ضوابط کے مطابق درست کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ کھلے دل سے انصاف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

(۲) آپ کو اس بات کی نگرانی کرنے کا حق ضرور پہنچتا ہے کہ کاشتکار بٹائی سے پہلے مشترک غلے میں بیجا تصرف نہ کریں اور مزارع کی حیثیت سے اپنے فرائض بھی ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں۔ لیکن اس نگرانی کو اس حد تک نہ بڑھنا چاہئے کہ مزارع کی حیثیت بالکل ملازم یا مزدور کی سی ہو کر رہ جائے، اور آپ کا نگران عملہ بالکل اپنے حکم کے تحت ان سے کام لینے لگے۔ اصولاً ایک مزارع آپ کا ملازم یا مزدور نہیں ہے بلکہ ایک شریک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہی سمجھ کر اس سے معاملہ کرنا چاہئے۔ مجھے مزارعین کی جو شکایات معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زمیندار اور ان کے ملازمین ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتے ہیں اور ان کے ہر کام میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ میرا مدعا اسی طریقے کی اصلاح ہے۔

(۳) وراثت کی تقسیم کا سوال ان موہوبہ اموال کے معاملے میں پیدا نہیں ہوتا جو کسی شخص نے اپنی زندگی میں (بشرطیکہ اندیشۂ موت کی بنا پر نہ ہو) کسی کو دیدئے ہوں۔ لیکن جو ترکہ متوفی نے چھوڑا ہو، وہ خواہ کم ہو یا زیادہ، اس کی تقسیم کا معاملہ وراثت کے قانون سے تعلق رکھتا ہے، اور اس معاملے میں کوئی ذمہ داری متوفی پر نہیں ہے،

بلکہ یہ پسماندگان کا کام ہے کہ وہ اس ترکہ کو شریعت کے مطابق تقسیم کریں۔ بالفرض اگر دوسرے وارث ایسا کرنے پر راضی نہ ہوں تو آپ یہ کر سکتے ہیں کہ جو حصہ شرعاً آپ کو پہنچتا ہو صرف اتنا ہی حصہ اپنے پاس رکھیں اور اس سے زائد جو کچھ ہو اس کو مناسب طریقے سے ان وارثوں میں بانٹ دیں جو اپنے شرعی حصے سے محروم رہ گئے ہوں۔

ہبہ کے بارے میں بھی یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ آیا یہ ہبہ اس نیت سے تو نہ تھا کہ وراثت کو شریعت کے مطابق تقسیم ہونے سے روکا جائے۔ (ا۔م)

ریاست اور حکومت کا فرق

سوال :۔

پاکستان کے نظام حکومت کی شرعی پوزیشن (قرارداد مقاصد کے زیر اثر) جو کچھ قرار پائی ہے، اس کے بارے میں اور ریاست و حکومت میں آپ جو فرق کرتے ہیں اُس کے بارے میں میرے دل میں کھٹک ہے۔ خود آپ ہی کے الفاظ نے اس مسئلہ کو میرے لئے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ سٹیٹ کی تعریف آپ نے یوں کی ہے :۔

"لفظ اسٹیٹ جس کا مترادف ہماری زبان میں ریاست کا لفظ ہے، علم السیاست کی اصطلاح میں اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت سے ضبط میں رکھتا ہو" (سیاسی کشمکش حصہ دوم ص ۱۰۰)

اگر اسٹیٹ سے مراد وہ نظام ہو جو قاہرانہ طاقت کے ذریعے نافذ ہو تو پھر سٹیٹ کی وفاداری کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اس مروجہ نظام کے وفادار ہیں جو اس وقت سٹیٹ کے ایکٹ کے نام سے ہم پر مسلط ہے کیا اس قسم کی تفریق قرون اولیٰ میں بھی پائی گئی ہے؟

جواب :۔

ریاست اور حکومت کے فرق کو آپ مسجد اور متولی کی مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یک محلے کے مسلمان

مثلاً اگر آپ کسی عمارت کے متعلق فیصلہ کرلیں کہ اسے مسجد بنانا ہے اور اس غرض کے لئے اسے وقف کردیں تو وہ مسجد بن جائے گی۔ اب اگر اس عمارت کی ساخت مسجد کے لئے مناسب نہیں ہے اور واقعی اسے مسجد کے طور پر تعمیر کرنے کا ارادہ کرچکے ہیں تو جب تک اس کے طرز تعمیر میں عملاً تغیر نہ ہو، وہ عمارت اپنی پہلی ہی ساخت پر رہے گی لیکن یہ صورت حال اس کو مسجد ہونے کے حکم سے خارج نہ کردے گی۔ اس مسجد کا انتظام اہل محلہ جس متولی کے سپرد کردیں گے وہ اس کے نظم و نسق کو چلائے گا۔ اب اگر وہ اپنی خود رائی سے اہل محلہ کے منشا کے خلاف اس مسجد میں ایسے کام کرنے لگے جو مسجد میں نہ ہونا چاہئیں، تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یہاں چونکہ مسجد کا سا کوئی کام نہیں ہو رہا ہے اس لئے یہ عمارت مسجد نہیں ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ چونکہ یہ متولی اس عمارت میں آداب مسجد کے خلاف کام کر رہا ہے اس لئے یا تو اسے درست کرنا چاہیے یا ہٹا دینا چاہیے۔

علیٰ ہذا القیاس جب اس ملک کے باشندوں نے اپنی آئینی زبان سے اس امر کا اعلان کردیا ہے کہ ان کی قومی ریاست الٰہی احکام و ہدایات کے تابع ہوگی تو یہ ایک اسلامی ریاست بن گئی، اور اس کی وفاداری ہم پر فرض ہوگئی۔ اگر اس کی ساخت ابھی تک ۱۹۳۵ء کے نقشے پر ہے تو یہ چیز اس کو اسلامی ریاست ہونے سے خارج نہیں کردیتی، کیونکہ ہم اس کی ساخت بدلنے کا فیصلہ کرچکے ہیں، اور جب تک یہ فیصلہ عملی جامہ نہ پہنے سابق ساخت کا برقرار رہنا ایک عملی مجبوری ہے۔ مسجد کے متولی کی طرح اس ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت اگر غلط طریقے سے انتظام کر رہی ہے تو اس کی وجہ سے ریاست کو غیر اسلامی قرار دینے کے بجائے ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ یہ حکومت ایک اسلامی ریاست کے انتظام کے لئے موزوں نہیں ہے، لہٰذا اس کو درست کرنا چاہیے یا بدل دینا چاہیے۔

(ا۔م)

(بقیہ اشارات) مختلف گروہوں کے لٹریچر پر نظر رکھتا ہے، خود ہی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اپنی تنقید و تبلیغ میں ہمارا رویہ کیا رہا ہے اور ہمارے مخالفین نے جواب میں کس تہذیب و شرافت اور معقولیت کا ثبوت دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے جماعت اسلامی کی تحریک، اس کے مقصد اور اس کی امتیازی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔ آگے چل کر ان صفحات میں ان شاء اللہ ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ پچھلے اٹھارہ سال میں یہ تحریک کن مراحل سے گزرتی ہوئی آئی ہے۔

مسئلہ ملکیت زمین

- زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن
- زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث
- مزارعت کا مسئلہ
- اصلاح کے حدود اور طریقے

★

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ
مکتبہ جماعت اسلامی
اچھرہ لاہور (پاکستان)